www.shibliinternational.com
November 2018

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad
Vol-1, Issue-9

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چند مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد حامد ہلال اعظمی
10/- روپے

نومبر ۲۰۱۸ء | علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار | جلد:۱۔شمارہ:۱۰

ماہنامہ
حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالقدوس، ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی،
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام
حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ
ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر فضیل احمد ندوی،
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

قیمت فی شمارہ: 20
سالانہ: 150 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli, Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	ظہور قدسی	علامہ شبلی نعمانیؒ	5
۲	علماء کے فرائض	علامہ شبلی نعمانیؒ	6
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۶)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	12
۴	علامہ شبلی نعمانیؒ کے خوابوں کا حسین تاج محل: دارالمصنفین	مفتی امانت علی قاسمی	16
۵	عدل جہانگیری (نظم)	علامہ شبلی نعمانی	21
۶	علامہ شبلی نعمانیؒ کی ادبی خدمات	ڈاکٹر قاری نصیر الدین منشاوی	22
۷	علامہ شبلی نعمانیؒ کی شخصیت اور ذوق مطالعہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	25
۸	اہل بیت رسول ﷺ کی زندگی میں (نظم)	علامہ شبلی نعمانیؒ	30
۹	علامہ شبلی اور مدارس اسلامیہ کا نصاب و نظام درس	احمد نور عینی	31
۱۰	غزلیات	علامہ شبلی نعمانیؒ	42
۱۱	شبلی مکاتیب شبلی اور ندوۃ العلماء: ایک مطالعہ	حکیم وسیم احمد اعظمی	43
۱۲	شبلی اور حالی	علامہ محمد اقبالؒ	52
۱۳	مولانا شبلی کی حیات کے اہم پہلو	ادارہ	53
۱۴	نذر شبلی (نظم)	ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی	41

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی...... الحاج **محمد منیر الدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد...... الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد
علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر)...... **علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)
الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد...... **محمد عبد الماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد
جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ جناب **محمد ابوطاہر** انجینئر، ٹولی چوکی حیدرآباد
ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد...... مولانا **محمد عبد القادر سعود**
نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد

ظہورِ قدسی

علامہ شبلی نعمانیؒ

چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چراغ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئی ہیں۔

ولادت: لیکن آج کی تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کردیئے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضاوقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر وباد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاسِ پاک، توحید ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجزہ طرازیٔ موسیٰؑ جان نوازیٔ مسیحؑ، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گردان ارز شاہنشاہِ کونین ﷺ کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ ''آج کی رات میں ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہوگیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آزر کدۂ گمرہی سرد ہوکر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس چمک اٹھا۔

یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہِ کونین،

شمسۂ نُہ مسندِ ہفت اختران — ختمِ رسل خاتم پیغمبران
احمدِ مرسل کہ خردخاک اوست — ہردوجہان بستۂ فتراک اوست
امی و گویا بہ زبان فصیح — از الف آدمؑ ومیم مسیحؑ
رسمِ تُرنج است کہ درروزگار — پیش دہد میوہ، پس آرد بہار

عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت واجلال ہوا، اللھم صل علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم

(سیرت النبیؐ جلد:۱، ص:۱۲۰۔۱۲۱)

علامہ شبلی نعمانی

علماء کے فرائض

زمانہ موجودہ کے لحاظ سے ہمارے علما کے فرائض کیا ہیں؟'' یعنی زمانہ موجودہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہمارے علما پر کیا ذمہ داریاں ہیں، ملک اور جماعت اسلامی کا ان پر کیا حق ہے قوم کے لیے ان کو کیا کرنا ہے؟ اور اس وقت انہوں نے قوم کے لیے کیا کیا ہے۔

یہ سوالات نہایت اہم ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ جماعت اسلام کی بہبودی کا بہت کچھ بلکہ تمام تر دارومدار ان ہی سوالات پر ہے۔

جس زمانہ میں یہاں اسلامی حکومت قائم تھی اس وقت قوم کے دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات علما کے ہاتھ میں تھے، نماز روزہ وغیرہ کے احکام بتانے کے علاوہ علما ہی ان کے مقدمے فیصل کرتے تھے، علما ہی جرائم پر حدود و تعزیر کی سزا دیتے تھے، علما ہی قتل وقصاص کے احکام صادر کرتے تھے؟ غرض قوم کی دین و دنیا دونوں کی عنانِ اختیار علما ہی کے ہاتھ میں تھی، اب جب کہ انقلاب حکومت ہوگیا اور دنیوی معاملات گورنمنٹ کے قبضۂ اختیار میں آگئے تو ہم کو دیکھنا چاہئے کہ قوم سے علما کا کیا تعلق باقی ہے، یعنی گورنمنٹ نے کس قدر اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے ہیں اور کس قدر باقی رہ گئے ہیں جو درحقیقت علما کا حق ہے اور جس میں دست اندازی کرنی خود گورنمنٹ کو مقصود نہیں ہے۔

علما کی موجودہ حالت ان کی عزلت نشینی بلکہ بے پروائی نے عام طور پر یہ یقین دلایا ہے کہ ان کو جو تعلق قوم سے باقی رہ گیا ہے وہ صرف مذہبی تعلق ہے، یعنی یہ کہ صرف نماز روزہ وغیرہ کے مسائل بتادیا کریں، باقی معاملات ان کے دست رس سے باہر ہیں اور ان کو ان معاملات میں دست اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لیکن میرے نزدیک یہ خیال غلط اور بالکل غلط ہے، گورنمنٹ نے جو حقوق اپنے لیے مخصوص کر لیے ہیں بے شبہ علما کو ان سے کچھ تعلق نہیں ہے لیکن وہ حقوق ہیں کیا، مال گذاری کا وصول کرنا، امن وامان کا قائم رکھنا، دنیوی معاملات کے فیصلے کے لیے عدالتوں کا قائم کرنا، عہدہ دارانِ ملکی کا مقرر کرنا، یہ اور خاص اسی قسم کے امور ہیں جو گورنمنٹ نے اپنے اختیار میں لیے ہیں لیکن قوم کی زندگی کے اجزا صرف اسی قدر نہیں ہیں۔

قوم کی اخلاق زندگی جو تمام ترقیوں کی جڑ ہے قوم کی علمی حالت جس پر ترقی وتنزلی کا مدار ہے، قومی مراسم و دستورات جن سے قوم بنتی یا بگڑتی ہے اور سب سے زیادہ قوم کی دماغی زندگی یعنی خیالات کی وسعت، بلند حوصلگی، روشن ضمیری، آزاد خیالی، ان تمام اوصاف کے سرچشمہ ہمارے علما اور علما کی تلقین وہدایت سے شادی بیاہ وغیرہ کی وہ مسرفانہ رسمیں جنہوں نے سینکڑوں ہزاروں خاندان تباہ کردیے ہیں، گورنمنٹ کا ان پر کچھ زور نہیں چل سکتا لیکن الحمدللہ اس گئی گذری حالت میں بھی علما کو قوم پر وہ اختیار حاصل ہے کہ آج اگر تمام علما متفق ہوکر کمربستہ ہوجائیں تو تمام ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک یہ خانہ برانداز رسمیں یک لخت معدوم ہوجائیں، قوم کے اخلاق جو روز بروز تباہ رہے ہیں گورنمنٹ اور گورنمنٹ کی تعلیم مطلق اس کی اصلاح نہیں کرسکی اور نہ کرسکے گی لیکن اگر علما آمادہ ہوں اور مناسب تدبیروں سے کام لیں تو قوم میں پھر وہ اخلاقی خوبیاں پیدا ہوسکتی ہیں جو دو سو برس پہلے موجود تھیں۔

الحاد اور دہریت کی طرف میلان جو روز بروز عام ہوتا

جاتا ہے، اس کا روکنا اگر گورنمنٹ کے لیے ممکن ہوتا تو وہ زیادہ نہیں تو مذہب عیسوی کو تو اس سے محفوظ رکھ سکتی، لیکن ہمارے علما اگر معقول طریقہ پر اس کو روکنا چاہیں تو اسی طرح اس کا قلع قمع کر سکتے ہیں، جس طرح یونانی فلسفہ کے پھیلنے کے وقت امام غزالی، امام رازی، قاضی عضد، ابن رشد نے زوقہ والحاد کا استیصال کر دیا تھا، ان باتوں سے ظاہر ہوا ہوگا کہ قوم کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اب بھی علما ہی کا حق ملکیت ہے اور وہی اس حصہ کی فرماں روائی کے کامل الاختیار ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

غرض اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علما کو قوم پر اب بھی نہات وسیع اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں، ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علما کو ضرورت نہ ہو لیکن قوم کو اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کیوں کہ علما جب تک قوم کے اخلاق، قوم کے خیالات، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کا تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لیں گے، قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔

علما کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ایک مجموعی قوت پیدا کریں، یعنی تمام ہندوستان کے علما میں ایک خاص رشتہ اتحاد قائم ہو، تمام علما ایک دوسرے کے نام سے، مقام سے، حالات سے واقف ہوں، آپس میں خط و کتابت ہو، مہتم بالشان امور میں تمام علما مشاورت اور استصواب سے کام لیں، کبھی کبھی وہ صرف اجتماع واتحاد کی غرض سے ایک جگہ جمع ہو جایا کریں۔

علما کے باہمی اتفاق کی نسبت بار بار کہا جا چکا ہے اور اگر مجھ کو بھی یہی کہنا ہوتا تو کچھ ضرورت نہ تھی کہ جو مضمون سیکڑوں دفعہ بیان کیا جا چکا ہے میں بھی اسی کا اعادہ کروں لیکن مجھ کو ایک خاص پہلو کی طرف خیال دلاتا ہے۔

اتفاق و اتحاد کا جو طریقہ اب تک لوگوں نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام علما مسائل فقہیہ میں ہم مذہب و ہم خیال ہو جائیں اور اس وقت نہایت اعلا درجہ کا اتحاد و اتفاق قائم ہو جائے گا۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایسا اتفاق کسی زمانہ میں کبھی ہوا ہے، صحابہ رضوان اللہ علیہم کے مبارک زمانہ میں جب کہ تمام مسلمان کنفس واحدۃ تھے کیا مسائل میں اختلاف آرا نہ تھا، جس شخص نے صحیح ترمذی مطالعہ کی ہے اور قریباً ہر مسئلہ کے متعلق اس کے تراجم ابواب دیکھے ہیں، کیوں کر اس بدیہی واقعہ سے انکار کر سکتا ہے۔

وضو، تیمّم، قرات اور دیگر واجبات و سنن کے متعلق کیا تمام صحابہ ہر مسئلہ میں قاطبۃً متفق الرائے تھے کون ایسا غلط دعویٰ کر سکتا ہے لیکن کیا ان اختلافاتِ مسائل کی وجہ سے ان میں کسی قسم کی کدروت تھی؟ کسی طرح کا رنج تھا؟ کسی طرح کی اجنبیت تھی؟ حاشاء اللہ کبھی نہیں ہرگز نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اتحاد و اتفاق کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپس میں کسی طرح کا اختلاف رائے نہ ہو، اس لیے ہم کو اتفاق واتحاد کے حدود متعین کر لینے چاہئیں، یعنی اختلاف واتفاق کے دائرے الگ الگ ہوں، ایک عالم کو کسی مسئلہ میں دوسرے سے اختلاف ہے تو اختلاف کا اثر اسی مسئلہ تک محدود رہے، یہ نہ ہو کہ اس اختلاف کی وجہ سے اور تمام تعلقات بھی منقطع ہو جائیں جو اختلاف سے کچھ تعلق نہیں رکھتے، اس کی نہایت عمدہ مثال امام بخاری و امام مسلم کا واقعہ ہے، امام مسلم حدیث معنعن کے شرائطِ اتصال میں امام بخاری سے اختلاف رکھتے تھے، چنانچہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں امام بخاری کا مذہب بیان کر کے کہا ہے کہ "یہ مذہب محض لغو اور باطل ہے اور اس قابل نہیں کہ اس کے رد کی طرف توجہ کی جائے"۔ لیکن باوجود اس کے جب امام بخاری سے ملنے گئے تو نہایت محبت اور تعظیم سے ان کی پیشانی چومی اور کہا کہ دعنی اقبل رجلک۔ (یعنی اجازت دیجیے کہ میں آپ کے پاؤں چوموں)۔

قرون اولیٰ میں اسی اصول پر عمل ہوتا تھا، یعنی اختلاف واتفاق کی جدا جدا حدیں تھیں اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں باوجود اختلاف کے اتحاد و اتفاق کا زور پوری طرح قائم تھا،

صحابہ بیسیوں مسائل میں مختلف الرائے تھے لیکن عام اتحادو اتفاق میں اختلاف کا پرتو تک نہ تھا قرن ثانی اور اوائل قرن ثالث کا بھی یہی حال تھا۔

آج جس کی وجہ سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی ہے، جس نے ہماری طاقت کو بالکل گھٹا دیا ہے، جس کی وجہ سے گورنمنٹ کی نگاہ میں اس گروہ کی عظمت نہیں رہی جس کی وجہ سے مخالفین کو ہم پر شماتت کا موقع ملا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اختلاف و اتفاق کو اصلی حدود پر نہیں رہنے دیتے۔

ہم نے بار بار سنا ہے کہ کوئی مجمع عام جماعت اسلام کے فائدے کی غرض سے منعقد ہوا، مثلاً دستار بندی کا جلسہ کسی مدرسۂ عربی کا جلسہ، اصلاحِ تعلیم کا جلسہ وغیرہ غیرہ تو وہ لوگ جلسہ میں شریک تک نہ ہوئے، جن کو بانیان جلسہ سے مسائلِ مختلف فیہا کے بارے میں اختلاف تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا بہت بڑا فرض جو علما پر ہے وہ اس دہریت اور الحاد کے اثر کا روکنا ہے جو آج کل یورپ میں پھیل کر ہندستان کی طرف بڑھتا آتا ہے، غالباً اس مرض کے پھیلنے سے کسی کو انکار نہیں ہے، گفتگو جو کچھ ہے وہ علاج کے طرز و طریقہ میں ہے لیکن میرے نزدیک ہم کو اس باب میں زیادہ خوض و فکر کی حاجت نہیں ہے، یہ بیماری پہلے بھی ایک دفعہ اسلامی ممالک میں پھیل چکی ہے اور اطبائے شریعت یعنی علمائے سلف کا علاج اس کے دفع کرنے میں کارگر ثابت ہوا ہے، عباسیوں کا اول اول زمانہ تھا کہ فلسفۂ یونانی کا ترجمہ ہوا اور ساتھ ہی چاروں طرح الحاد کی ہوا چل گئی، اکثر فقہا اور بعض محدثین نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ سرے سے فلسفہ پڑھایا نہ جائے، یہاں تک علم کلام کو اس لحاظ ممنوع قرار دیا کہ اس میں عقلیات کی آمیزش تھی، امام شافعی کا قول ہے کہ **حکمی فی اھل الکلام ان یضربوا بالجرید ویطاف بھم فی القبائل** ،یعنی اہل کلام کے بارے میں میرا یہ فیصلہ ہے کہ ان کو درے لگائے جائیں اور قبائل میں ان کی تشہیر کی جائے اس علاج نے بہ لحاظ حالت موجودہ کسی قدر فائدہ دیا، یعنی بعض نیک دل فلسفہ پڑھنے سے رک گئے لیکن پورا نفع نہ ہوا، کیونکہ سینکڑوں ہزاروں مسلمانوں منطق وفلسفہ پر ایسے فریفتہ ہو گئے تھے کہ اس کو بالکل چھوڑ نہ سکے تھے، آخر علما نے دوسرا علاج سوچا یعنی فلسفہ کے مسائل پر اطلاع حاصل کر کے فلسفہ کے روک کے لیے علم کلام ایجاد کیا، اس علاج کے مجوزہ امام غزالی، امام رازی، ابن رشد، قاضی عضد وغیرہ تھے اور واقعی ان کی یہ تدبیر نہایت کارگر نکلی، اسی کا اثر ہے کہ اگرچہ درسِ نظامیہ میں تمام علوم وفنون سے زیادہ منطق وفلسفہ کی کتابیں زیر درس ہیں، تاہم مذہبی عقائد کو ان سے کچھ ضرر نہیں پہنچتا۔

ہمارے زمانے میں بھی اسی مرض نے ظہور کیا ہے اور پہلی قسم کا علاج بھی ہو چکا ہے، اب اگر وہ علاج مفید ثابت ہوا تو فبہا ورنہ دوسری قسم کا علاج شروع کیا جائے اور امام غزالی اور امام رازی کی روحیں تازہ کی جائیں۔

ترکی حکومت میں اس ضرورت کو تسلیم کر کے علامہ حسین جسر نے تمام روم وشام میں علوم دینیہ وعقلیہ کا استاذ تسلیم کیا جاتا ہے، ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام حمیدیہ ہے، تمام مسلمانوں نے اس تصنیف کی نہایت قدر کی اور خود سلطان المعظم خلد اللہ دولتہ نے علامہ مذکور کو اس کتاب کے صلہ میں بہت کچھ انعامات اور عطیے عنایت کیے، یہ کتاب ترکی زبان میں بھی ترجمہ کی گئی اور عام طور پر اس کا رواج ہو گیا۔

میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے اور اگرچہ میرے نزدیک وہ موجود ضرورت کے لیے ناکافی ہے، تاہم اس بات سے مسرت ہوتی ہے کہ اس نے ایک عمدہ کام کی بنیاد ڈالی، یہ دوسروں کا فرض ہے کہ اس بنیاد پر مضبوط اور مستحکم عمارتیں بنائیں۔

تیسرا امر جس کی طرف میں علما کی توجہ مائل کرانا چاہتا ہوں علوم اسلامیہ کے درس وتدریس میں وسعت پیدا کرنا ہے۔

اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ پچاس ساٹھ برس سے ہماری علمی حالت برابر تنزلی کی طرف بڑھ رہی ہے، جس درجہ کے علما پچاس برس پہلے موجود تھے اس زمانہ کے بعد اس درجہ کے علما نہیں پیدا ہوئے اور زمانہ مابعد میں جس رتبہ کے علما

پیدا ہوئے اس زمانہ کے بعد اس درجہ کے بھی پیدا نہیں ہوئے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ، مفتی محمد یوسف صاحبؒ، مولوی فضل حق صاحبؒ جیسے علما کا پیدا ہونا اب گویا ناممکن معلوم ہوتا ہے، بلکہ اب تو یہ بھی توقع نہیں کہ مولوی عبدالحیٔ صاحب مرحوم ارشاد حسین صاحب مرحوم، مولانا علی صاحب مرحوم جیسے بزرگ بھی قوم میں پیدا ہوں، تصنیفات کا یہ حال ہے کہ عربی زبان میں اب بہت کم کتابیں لکھی جاتی ہیں اردو زبان میں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ بھی کچھ محققانہ نہیں ہوتیں، بلکہ صرف چند نزاعی مسئلوں کے متعلق ادھر ادھر کی خوشہ چینی ہوتی ہے، پھر کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ اب علوم عربیہ کی قدردانی نہیں رہی اور ان علوم کے پڑھنے والوں کو مناصب اور عہدے نہیں ملتے لیکن ذرا سے غور سے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ اس بات کی وجہ نہیں ہوسکتی۔

خدا کا شکر ہے اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے علم کو کبھی تحصیل دولت کے لیے نہیں پڑھا، علما کسی زمانہ میں بہت دولت مند یا صاحب جاہ و منصب نہ تھے، ملا نظام الدین، ملا حسن، ملا کمال، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب کو کون سی دولت و ثروت حاصل تھی۔

پھر کیا اس کی وجہ یہ ہوسکتی کہ علوم کی تحصیل کے سامان کم ہیں، یہ بھی صحیح نہیں، اب جس کثرت سے ہندوستان کے ہر گوشہ میں عربی مدارس موجود ہیں، پہلے کبھی نہ تھے جس قدر کتابیں اب چھپ کر شائع ہوگئیں، اگلے زمانے میں کہاں دستیاب ہوتی تھیں، سفر کے وسائل اور ذرائع جیسے اب آسان ہوگئے ہیں پہلے کب تھے؟

پھر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اخیر زمانہ ہے اور اس برے زمانہ کا اقتضا ہی یہ ہے کہ اگلی سی ہمتیں اور اگلی سی حوصلہ مندیاں زمانہ سے مفقود ہو جائیں لیکن اگر ایسا ہے تو زمانہ تمام دنیا کو محیط ہے، اس لیے دنیا کے ہر گوشہ میں ایسی ہی پستی اور ایسا ہی تنزلی پایا جانا چاہئے، حالانکہ کہ دنیا کے اور حصوں میں علوم وفنون کی بہار آرہی ہے، میں اس وقت اجمال کے ساتھ دکھانا چاہتا ہوں کہ دنیا کے اور حصوں میں ان ہی علوم وفنون کو کس قدر ترقی ہے اور ترقی کے کیا کیا وسائل پیدا ہوگئے ہیں۔

اگرچہ ہندوستان کی موجودہ حالت دیکھ یہی قیاس ہوتا ہے کہ اب علمی ترقی کے میدان میں کوئی وسعت پیدا نہیں ہوسکتی لیکن شام و مصر اور بالخصوص یورپ کی علمی رفتار کے لحاظ سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس زمانہ میں جو سامان پیدا ہوگئے ہیں اور علوم وفنون کے متعلق نظر وفکر کے جو طریقے اب ایجاد ہوئے ہیں، پہلے ان کا نام ونشان بھی نہ تھا، اگرچہ ممکن تھا کہ میں اس مضمون پر منطق، حکمت تاریخ، جغرافیہ، طبعیات وغیرہ ہر ایک علم کے لحاظ سے بحث کرتا لیکن اس قدر وقت اور فرصت نہیں ہے، اس لیے صرف فن ادب کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔

فن ادب کوئی معمولی فن نہیں ہے، قرآن مجید اور احادیث کے سمجھنے اور ان کے نکات سے واقف ہونے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام بڑے بڑے مفسرین اور محدثین ادب میں نہایت کمال رکھتے تھے، فن ادب میں ہمارے یہاں صرف مقامات حریری، متنبی، سبعہ معلقہ درس میں داخل تھا اور بعض لوگ تاریخ تیموری ونفحۃ الیمن بھی پڑھتے تھے، صرف یہی نہیں تھا کہ درسی کتابیں ان ہی میں منحصر تھیں، بلکہ ادب کا کل سرمایہ جو ہمارے ملک میں دستیاب ہوسکتا تھا، وہ یہی کتابیں یا ان کی شرحیں اور حاشیے تھے۔

اب خیال فرمایئے کہ آج کل ادب کا کس قدر سرمایہ پیدا ہوگیا ہے، جاہلیت اور شروع اسلام کے اشعار کی نسبت مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کے مطالب سمجھنے کے لیے ان پر اطلاع حاصل ہونی ضرور ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے: **الشعر دیوان العرب فاذا خفی علینا الحرف من القرآن رجعنا الی دیوانھا**، ان کی ہی کا قول ہے **اذا سالتمونی عن غریب القرآن فالتمسوہ فی الشعر**،

جن اشعار کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فہم قرآن کے لیے ضروری سمجھا، ان میں ہمارے پاس صرف سبعہ معلقہ موجود تھا لیکن اب شام ومصر وغیرہ میں اشعار عرب کا بے انتہا ذخیرہ موجود ہوگیا ہے شعرائے جاہلیت ومخضر میں سے امراء القیس، زہیر بن ابی سلمٰی، لبیدہ بن ربیعۃ العامری، نابغہ ذبیانی، علقمہ الفحل، عروہ بن الورد، حاتم طائی، اوس بن حجر، خنسا، عنترہ بن شداد العبسی، طرفہ بن عبد بکری، حادرہ کے دیوان چھپ گئے ہیں، قبیلہ ہذیل جن کو نسبت تسلیم کیا گیا ہے کہ عرب کے تمام قبائل میں سب سے فصیح تر تھے، اس قبیلہ کے تمام شعرا کا کلام ایک مجموعہ میں چھاپا گیا ہے، خلیفہ منصور عباسی نے خلیفہ مہدی کی تعلیم کے لیے اشعار عرب کا جو مجموعہ تیار کرایا تھا اور جس کو علامہ مفضل ضبی نے جمع کیا تھا، بیروت میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔۔۔۔۔

علما کا ایک اور سب سے بڑا فرض بلند حوصلگی اور عالی ہمتی کا پیدا کرنا ہے، اس سے خدانخواستہ میری یہ مراد نہیں کہ وہ بڑی بڑی نوکریوں کی خواہش کریں دولت کے جمع کرنے کی تدبیریں سوچیں بلکہ میری مراد علمی اور مذہبی حوصلہ مندی ہے، وہ جس کا یہ اثر تھا کہ اندلس کے طلبہ ہندوستان میں تحصیل علم کے لیے آتے تھے، جس کا اثر یہ تھا کہ ابن بیطار نے نباتات کے دریافت کے لیے اندلس سے چل کر یونان اور بحر روم کے تمام جزائر کی خاک چھان ڈالی تھی، جس کا یہ اثر تھا کہ جغرافیہ کی تحقیقات کے لیے علامہ بشاری نے پورے ۲۸ برس دنیا کے سفر میں صرف کر دیے تھے جس کا یہ اثر تھا کہ ابوالفرج اصفہانی نے پورے پچاس برس صرف کر کے کتاب الاغانی لکھی اور دنیا کو علم ادب کے بڑے بڑے کتب خانوں سے مستغنی کر دیا جس کا یہ اثر تھا کہ اصمعی محاورات عرب کی تحقیقات کے لیے عرب کے بیابانوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔

کیا موجود زمانہ میں ان حوصلہ مندیوں کی ایک بھی مثال پائی جاتی ہے اور کیا ان حوصلہ مندیوں کے بغیر علما اپنے فرض سے ادا ہو سکتے ہیں۔

افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ علمی حوصلہ مندی اس قدر مفقود ہوگئی ہے کہ ہم اس کے امکان کا بھی تصور نہیں کر سکتے، حالانکہ وہ حوصلہ مندیاں دوسری قوموں میں موجود ہیں اور اگر آپ اجازت دیں تو مثال کے طور پر صرف ان عجیب وغریب کوششوں کا ذکر کروں جو دوسری قوموں نے خاص ہمارے علوم وفنون کے ترقی دینے میں کی ہے۔

(ا) سب سے بڑا احسان جو یورپ کا عربی زبان اور عربی علوم وفنون پر ہے یہ ہے کہ عربی کی وہ کتابیں جو مسلمانوں کے لیے مایۂ فخر ہیں اور باوجود اس کے اس قدر نایاب تھیں کہ کہیں ان کا پتہ بھی نہیں لگتا تھا، یورپ نے نہایت تلاش سے بہم پہنچائیں، ان کی تصحیح کی، حاشیے چڑھائے، اختلاف نسخ قلم بند کیے، مضامین والفاظ کی فہرست مرتب کی اور نہایت حسن وخوبی کے ساتھ چھاپ کر مشتہر کیا۔

ان محنتوں کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جس جرمن پروفیسر نے کتابت الفہرست کی تصحیح وترتیب کی اس کے پورے بیس سال اس کام میں صرف ہوئے، پروفیسر وایٹ ۱۸ برس سے جریر کے دیوان کے مرتب کرنے میں مصروف رہے، برلن کی ایک کمیٹی نے لاکھ روپے صرف اس کام کے لیے وقف کر دیئے کہ طبقات ابن سعد کا پورا نسخہ جو بارہ جلدوں میں ہے چھاپ دیا جائے، چنانچہ خاص اس غرض سے پروفیسر زاخو اپریل ۱۸۹۵ء میں مصر پہنچا اور اب تک وہیں مقیم ہے، اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں، اس وقت عربی کی جس قدر نایاب کتابیں یورپ نے چھاپ کر شائع کیں، ان سب کا نام تو میں گنا نہیں سکتا لیکن تاریخ کی تصنیفات کی ایک فہرست ذیل میں لکھتا ہوں جن میں اکثر خود میری نظر سے گذری ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں جو یورپ کے چھاپنے سے پہلے ناپید تھیں اور ہمارے ہندوستان کے علما اب بھی ان کے ناموں سے بے خبر ہیں، ان میں سے بعض مصر وغیرہ میں چھپی ہیں، تو یورپ ہی

کے نسخے سے منقول ہوکر چھپی ہیں۔

تاریخ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، تمام وکمال ۱۲ جلد، اخبار الطوال، ابوحنیفہ دینوری، کتاب البینہ، والاشراف للمسعودی، انساب الاشراف للبلاذری، تاریخ یعقوبی، فتوح البلدان بلاذری، کتاب الفہرست ابن الندیم بغدادی، رحلہ ابن جبیر، المعجب، البیان المغرب فی اخبار المغرب للمراکش، سیرۃ صلاح الدین للقاضی بہاء الدین بن شداد، الفتح القسی للعماد والاصفہانی، مذیل للطہری، المشتبہ للذہبی، معجم ابن آبار، اخبار مکتبہ للازرقی، المشفی باخبار ام القری، اعلام باعلام بیت اللہ الحرام، استبصار فی عجائب الامصار، الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ، کتاب الآعتبار لابن منقذ، الامام للمقریزی، البیان والاعراب بما بارض مصر من الاعراب، کتاب الہند للبیرونی الجز عند اول دولۃ من دول الاشراف العلومین العیون والحدایق، زبدالحلب فی تاریخ حلب، تاریخ آل سلجوق، زبدۃ النصرہ فی اخبار الوزراء، السلجوقیہ، سلسلہ التواریخ، اخبار العصر، اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس، تاج التراجم للقاسم بن قطلو بغا، الفخری فی الآداب السلطانیہ، مروج الذہب للمسعودی، کتاب الصلۃ لابن بشکوال، تکملہ کتاب الصلۃ، بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبقات المفسرین للسیوطی، اخبار ملوک مغرب والفاس للمقریزی، عجائب الہند لیزوک بن شہریار، کتبۃ عقلیہ، تہذیب الاسماء للنووی، کتاب الانساب للمقدسی، فتوح الشام للازدی، ملخص طبقات الحفاظ للسیوطی، معارف ابن قتیبہ۔

ان کتابوں کے علاوہ یورپ نے جغرافیہ کی تصنیفات کا پور سلسلہ مرتب کرکے چھاپا، ہمارے خیال میں بھی نہ تھا کہ جغرافیہ کے فن میں جو اس ملک میں خاص انگریزوں کی بدولت آیا ہے اور اسی وجہ سے ہمارے علما اس سے بالکل ناآشنا ہیں، مسلمانوں نے کوئی خاص کمال پیدا کیا تھا لیکن ان تصنیفات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے اس فن کی کیا حالت تھی اور مسلمانوں نے اس کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا، کس کو خیال تھا کہ تیسری صدی ہجری میں عرب کا ایسا جغرافیہ تیار ہوا ہوگا جو بالکل آج کل کی تحقیقات کے موافق ہے، جس میں عربی کے ایک ایک گاؤں کی تفصیل ہے اور ہر ہر گاؤں کی پیداوار عمارات، معدنیات، اشجار، نباتات، جانور، تجارت وغیرہ کے حالات تفصیل سے مذکور ہیں، عرب کا یہ جغرافیہ ابن الحائک ہمدانی نے ۳۳۴ھ میں لکھا جو یورپ میں بمقام لیڈن ۱۸۸۴ء میں چھاپا گیا۔

جغرافیہ کے سلسلہ میں جو نایاب کتابیں یورپ میں چھاپی گئیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں: معجم البلدان یاقوت حموی چار جلد، مشترک یاقوت حموی، آصد الاطلاع، احسن التقاسیم فی معرضۃ الاقالیم، جغرافیہ ان حوقل بغدادی، مختصر کتاب البلدان لابن الفقیہ الہمدانی، کتاب البلدان للیعقوبی، تقویم البلدان، المسالک والمما لک لابن خرداذبہ، مسالک المما لک للاصطخری، نزہۃ المشتاق للشریف الادریسی۔

یہ سب سے بڑی ضخیم کتابیں ہیں اور ان کے دیکھنے سے مسلمانوں کی علمی کوششوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔۔

دوسری قومیں خود ہمارے علوم وفنون میں ایسی عجیب وغریب کوششیں کر رہی ہیں اور عربی زبان کے میدان میں اس قدر وسعت پیدا ہوگئی ہے تو کیا ہم کو اسی پر قناعت کرنی چاہئے؟ کہ ایک محدود کورس کی چند کتابیں پڑھائی جائیں اور تمام عمر اسی محدود دائرے میں بند پڑے رہیں؟

علمی حوصلہ مندی جس کو میں نے علما کا فرض بتایا ہے، اس کا یہ اقتضا ہے کہ اگلوں نے ہمارے لیے جو سرمایہ چھوڑا تھا، دنیا سے ہم جائیں تو اس میں اضافہ کرکے جائیں، یہ خیال غلط اور بالکل غلط ہے کہ علمی کارخانے میں کام کرنے کے لیے اب کچھ باقی نہیں رہا، ابھی بہت کچھ وسعت ہے اور بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔

فیض روح القدس ارباز ومدحی فرماید
دیگراں نیز کنند انچہ مسیحا می کرد

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

گذشتہ سے پیوست

گلشن ہند کے اسی مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے اس پر بھی نقد ضروری خیال کیا ہے، اور چراغ پا ہو کر لکھا ہے کہ:

''افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے لالہ چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصا ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پر ہے''۔(ایضا ص ۲۱)

نقادوں کے درمیان تضاد بیانی کی یہ پہلی مثال نہیں ہے۔ حالی و شبلی معاصر ہیں اور دونوں زندہ ہیں خط و کتاب ہے باوجود اس کے مولوی صاحب نے کس انداز سے شبلی کی تردید کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چاہے جس کا موقف درست ہو تحقیق و تنقید میں مولوی عبدالحق کا یہ اسلوب درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس مقدمہ میں بابائے اردو سے کئی اصولی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، جن کی نشاندہی اور تجزیہ ہمارا موضوع نہیں تاہم ایک دو کا ذکر ضروری ہے کہ ان کا تعلق بھی علامہ شبلی ہی سے ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ تذکرہ گلشن ہند کا مخطوطہ مولوی غلام محمد کے ہاتھ لگا تھا اور انھوں نے ایڈٹ کر کے شائع کرنے کے لئے مولانا شبلی کے حوالہ کیا تھا، لیکن بابائے اردو لکھتے ہیں:

''یہ کتاب شعرائے اردو کا قابل قدر اور نایاب تذکرہ ہے اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت شخص (عبداللہ خاں) کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی، میں خود بے بضاعت، تاہم اس فرمائش کو جو انھوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا اور بسر و چشم قبول کیا''۔(مقدمات عبدالحق ص ۶۱)

اسے صرف نظر سے نہیں بددیانتی کا نام دیا جانا چاہئے۔

بابائے اردو نے اصل کتاب میں ترمیم و تنسیخ کی، حالانکہ ان کو یہ اختیار نہ تھا، ایک متنی محقق کو تصحیح متن اور ضروری حواشی کے سوا کسی کے کلام کو خارج یا اضافہ کرنے کا حق نہیں ہوتا لیکن انھوں نے ایسا کیا۔ عبداللہ خاں لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے البتہ صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونہ کلام جو اس تذکرہ میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا اس میں صرف عمدہ نمونہ چن لیا گیا ہے اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوق سلیم نے انجام دیا ہے، اس کے سوا اس میں اور کوئی تصرف نہیں کیا گیا''۔(التماس ص ۱۲)

اب بابائے اردو کا بیان سنئے، فرماتے ہیں:

''مؤلف نے شعراء کا کلام جو بطور انتخاب درج کیا ہے اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے۔ صرف اعلی درجہ کے اشعار رکھے ہیں، خود مؤلف نے

اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دیئے تھے اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا''۔(مقدمہ ص۲۴)

مقدمہ نگار اور پبلشر کے اقتباسات سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں، ایک یہ کہ پبلشر کی التماس بابائے اردو کی نظر سے نہیں گذری ورنہ یہ تضاد اس میں پیدا نہ ہوتا دوسرے یہ کہ تذکرہ گلشن ہند کی تصحیح و تدوین اور تحقیق متن کا کام اب بھی باقی ہے اور ضروری ہے کہ اصل تذکرہ کو محقق انداز میں شائع کیا جائے اور دکھایا جائے کہ مولوی عبدالحق کے تصرفات بیجا سے شعرا کا کون کون سا کلام سامنے نہ آسکا۔

عبداللہ خاں کی دو صفحے کی التماس نے علامہ شبلی کے اس کام کو روشنی میں لا دیا ورنہ شبلی کی اس کاوش سے زمانہ کبھی واقف نہ ہوتا۔

بابائے اردو نے دیانت کے خلاف ایک اور کام کیا ہے۔اصل تذکرہ میں شاہ ولی اللہ اشتیاق کی بعض کتابوں کے نام غلط درج تھے، مولانا شبلی نے حاشیہ میں اسے غلط بتایا ہے۔ در اصل مرزا علی لطف نے شاہ ولی اللہ اشتیاق کو شاہ ولی اللہ دہلوی تصور کر لیا ہے، اس ضمن میں ان کی بعض کتابوں کے نام لکھے تھے شبلی نے ان کتابوں کو فرضی قرار دیا ہے، دراصل انھوں نے بھی شاہ ولی اللہ اشتیاق کو شاہ ولی اللہ دہلوی ہی سمجھا ہے، تعجب تو یہ ہے کہ بابائے اردو نے شبلی کے فٹ کو اپنے مقدمہ میں اپنی تحقیق بتا کر پیش کر دیا ہے۔(مقدمات عبدالحق ص ۸۷)

۲۔ تذکرہ گلشن ہند میں میر اثر کی مثنوی خواب وخیال پر حالی وشبلی کی متضاد آرا اور اس پر مولوی عبدالحق کے تند وتیز تبصرے کا تفصیلی ذکر اوپر آچکا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں بابائے اردو نے اسے مرتب کر کے شائع کیا، اس پر بھی انھوں نے حسب توقع طویل مقدمہ لکھا اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ وہ جس کتاب پر مقدمہ لکھتے ہیں کتاب اور صاحب کتاب کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے، یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض مقدمے طوالت اور جامعیت کے لحاظ سے کتاب کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ان کا اسلوب نگارش یا دوسرے لفظوں میں ان کی نثر طول بیانی کا بھی نمونہ ہے، اس میں بعض غیر ضروری باتیں بھی وہ لکھ جاتے ہیں۔

بابائے اردو نے علامہ شبلی کے متعلق تذکرہ گلشن ہند کی بحث کو مثنوی خواب وخیال کے دیباچے میں پھر دہرایا ہے اور تقریباً اسی انداز سے خامہ فرسائی کی ہے۔

(مقدمات عبدالحق ص ۲۳۲)

۳۔ مقدمہ تمدن ہند: تمدن عرب کے مصنف موسیو لیبان کی دوسری تصنیف تمدن ہند ہے۔ مولوی سید علی بلگرامی (۱۸۵۱-۱۹۱۱ء) نے اسے اردو جامہ پہنایا ہے۔اس پر بھی مولوی عبدالحق کے قلم سے مقدمہ ہے۔اصل کتاب اور ترجمہ کے ذکر سے پہلے بابائے اردو نے مترجم کے مفصل حالات وسوانح قلم بند کئے ہیں جس میں ولادت سے وفات تک کے تمام احوال لکھے ہیں۔

مولوی سید علی بلگرامی دولت آصفیہ میں بڑے عہدہ پر فائز تھے اور زندگی کا بیشتر حصہ حیدر آباد میں گذارا۔ مقدمہ نگار کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے، اس لئے ان کے ذاتی اور نجی حالات اور دیکھے اور برتے ہوئے واقعات بھی لکھے ہیں۔

مولوی سید علی بلگرامی گو عمر وعہدہ میں علامہ شبلی سے بڑے تھے مگر دونوں میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ پہلی بار سر سید کے ساتھ جب شبلی حیدر آباد گئے تھے تب سے مراسم تھے۔ الفاروق کے دیباچہ میں ان کا بڑا والہانہ ذکر ہے۔ علامہ شبلی جب حیدر آباد گئے تو ان کے تعلقات میں اور گہرائی اور موانست پیدا ہوگئی۔ ابتداء میں شبلی کا قیام ان کے مکان پر ہی رہا، ان کا قیمتی کتب خانہ جدید علوم کی کتابوں اور قدیم اسلامی ذخائر کا معدن تھا، ایک وجہ تعلقات کی یہ بھی تھی، وہ ان کی مجلس کے حاضر باشوں میں تھے، یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے متعدد جگہ ان کی مجلسوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سوائے ایک دو جگہ کے ہر جگہ شبلی کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ یہاں انھیں نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ حیدر آباد میں علامہ شبلی کے تقرر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مرحوم (مولوی سید علی بلگرامی) نے نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدرداں امیر تھے، ایک سر رشتہ علوم وفنون قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعہ تصنیف وتالیف وترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہونچایا جائے، مرحوم اس سر رشتے کے نگراں مقرر ہوئے اوران کی زیر نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف وترجمہ ہوئیں، لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لئے کوئی مناسب شخص انھیں نہ ملا تھا، لہٰذا انھوں نے شمس العلما مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمت ناظم سر رشتہ علوم وفنون پر بہ مشاہرہ...... ہوا۔ درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ مولانا کی چند کتابیں بھی اس سلسلے میں شائع ہوئی تھیں، لیکن ملک کی بدنصیبی سے یہ سر رشتہ ٹوٹ گیا''۔

(مقدمات عبدالحق ص ۳۸۶)

بابائے اردو نے مولانا شبلی کے انتخاب کو بہت اچھا بتایا ہے، لیکن اس طرح کہ کوئی مناسب آدمی نہیں ملا تھا، اس لئے مولانا شبلی کا انتخاب ہوا، لیکن یہ واقعہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۰۱ء میں جب علامہ شبلی حیدرآباد پہونچے تو ناظم سر رشتہ علوم وفنون کے عہدہ پر مولوی مرتضی صاحب فائز تھے، مولوی عزیز مرزا نے ان کا تبادلہ شعبہ مالیات میں کرایا اوران کی جگہ پر علامہ شبلی کا تقرر عمل میں آیا۔

۲۔ مولوی سید علی بلگرامی کی مروت اوراہل علم کی قدر دانی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مجلس کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''مرحوم بہت بامروت تھے، اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اس کو پوری نہ کرسکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دوسری بار پھر آتا تو اسی شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد برآری میں کوشش کرتے، یہاں تک کہ کتابیں جو انھیں بہت عزیز تھیں ان کے دینے میں بھی تامل نہ تھا بشرطیکہ وہ سچا قدرداں ہو خاص کر طالب علموں اور اہل علم کا بہت خیال کرتے تھے چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علی خاں مرحوم کے یہاں مدعو تھے، بارہ بجے کھانے کے بعد چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے شعر سناتے رہے جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوئے۔ مرحوم نے ان کی درخواست پر فوزا'' کامل مبرد'' کا بہت عمدہ نسخہ مطبوعہ یورپ جس کی قیمت ستر روپئے ہے، مولانا کی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ جیسا طالب علم جو کتابوں کا شوقین ہے اہل علم کی درخواست رد نہیں کرسکتا''۔ (مقدمات عبدالحق ص ۳۹۳۔۳۹۴)

اب دیکھئے، مولوی سید علی بلگرامی نے خوش ہوکر کتاب نذر کی ہے مگر مولوی عبدالحق نے اسے درخواست بنادیا۔

۳۔ اسی سلسلہ یعنی کتاب نذر کرنے کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو:

''مرحوم (مولوی سید علی بلگرامی) نے رد المنطقیین لابن تیمیہ اپنے خرچ سے نقل کرواکر مولوی شبلی کی نذر کی، انگلستان پہونچ کر مرحوم نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں کی ایک علمی سوسائٹی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہے، آپ وہ نسخہ بھجوا دیجئے، مولانا اپنی عادت کے موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت سست لکھا بلکہ یہ تک تحریر فرمایا کہ چونکہ یہ کتاب آپ کے خرچ سے نقل ہوئی ہے اس لئے آپ طلب کرتے ہیں۔ مرحوم نے اس درشت اور عتاب آمیز خط کا جواب یہ دیا کہ پانچ سو روپئے کی عمدہ کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھجوادیں، چنانچہ اس کے بعد جب مولانا شبلی سرکار عالی کی درخواست پر دارالعلوم کے نصاب تعلیم کے مرتب کرنے کے لئے حیدرآباد تشریف لائے تو اس شرمندگی کے بارے میں ملے نہیں، لیکن کتب خانے کے جلسہ انتظامی میں اتفاق سے جب مٹھ بھیڑ ہوگئی تو مرحوم اس خندہ پیشانی سے پیش آئے جو ان کا شیوہ تھا''۔ (مقدمات عبدالحق ص ۳۹۴)

اس بے سروپا قصہ میں انھوں نے علامہ شبلی کی عادت

سخت بگڑنے والی بتائی ہے، ایک طرح سے محسن کش بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مولانا شبلی نے سرے سے اس طرح کے کسی واقعہ کی تردید کردی تب بھی اس عبارت کو مقدمہ سے خارج نہیں کیا بلکہ ہوبہو باقی رکھا اور جب چند ہم عصر شائع کی تو اس طویل افسانہ کے جواب میں حاشیہ پر ایک سطری نوٹ لکھ کر خاموش ہوگئے۔ (چند ہم عصر ص ۸۰)

۴۔ انھیں سے متعلق ایک اور واقعہ سنئے:

"جب اہل علم میں سے کوئی شخص حیدرآباد میں وارد ہوتا تو وہ خواہ کہیں کا ہو ان کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ ان کا مہمان ہو۔ چنانچہ مولانا شبلی جب حیدرآباد تشریف لائے تو مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے مہمان ہوئے۔ مرحوم کو جب دوسرے روز اطلاع ہوئی تو فوراً پہنچے اور اپنے گھر لے گئے، لیکن جب مولانا ملازم ہوتے ہی دوسری جگہ اٹھ گئے تو مرحوم کو بہت رنج ہوا، اور یہ رنج ان کے خطوط سے بھی مترشح ہوتا ہے"۔ (ایضاً ص ۳۹۴۔۳۹۵)

اس اقتباس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ شبلی دو چار روز مولوی سید علی بلگرامی کے یہاں رہے اور جونہی ملازمت ملی ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی لیکن یہ واقعہ نہیں مولانا شبلی ان کے یہاں نو ماہ رہ چکے تھے، اس سے زیادہ اور کوئی کیا رواداری نبھا سکتا ہے اور اس نو مہینہ رہنے کا انجام ملاحظہ ہو۔

۵۔ مولوی عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"جس زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم ان کے یہاں مہمان تھے ایک روز فرمانے لگے کہ میں اس کا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے مہمان ہیں بلکہ الٹا میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی، مگر ایک بات کا آپ کو میرا شکر گذار ہونا چاہئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری ایک بیوی ہے اور پھر بھی میں اسے نو مہینے چھوڑ کر آپ کے ساتھ کھانا کھاتا رہا"۔ (ایضاً ص ۴۰۶)

یہ دراصل دونوں کے درمیان بے تکلفانہ باتیں تھیں جن کو مولوی عبدالحق نے شبلی کی تحقیر کے لئے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔

۶۔ شیعہ اور شیخ عبدالقادر جیلانی

"ایک دفعہ شمس العلماء مولوی شبلی نے پوچھا کہ شیعوں کو شیخ عبدالقادر جیلانی سے کیوں عداوت ہے، حال آنکہ انھوں نے شیعوں کے رد وغیرہ میں بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ رد لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی کے بہت سے اسباب ہیں۔ اگر آپ ہمارے بجائے ہوتے تو آپ کو بھی ان سے دشمنی ہوتی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی۔ مولانا نے پوچھا وہ کیوں کر؟ فرمایا کہ آدھی اسلامی دنیا حضرت شیخ عبدالقادر کی نذر و نیاز کرتی ہے اور اٹھتے بیٹھتے ان کا نام لیتی ہے اگر یہ شخص نہ ہوتا تو سب ہمارے ائمہ کی پرستش کرتے، اگر اسی طرح آپ کی آدھی سلطنت جاتی رہتی تو ہم آپ سے پوچھتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں"۔ (ایضاً ص ۴۰۰)

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
AcN: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

مفتی امانت علی قاسمی - استاذ حدیث وفقہ دار العلوم حیدر آباد

علامہ شبلی کے خوابوں کا حسین تاج محل دار المصنفین اعظم گڈھ

عباسی عہد خلافت کے عظیم فرماں رواں ہارون رشید نے علم وحکمت کی ترویج واشاعت اور علوم اسلامیہ کے فروغ کے لئے بیت الحکمت کی بنیاد ڈالی تھی، جس کی وجہ سے بغداد دنیا کے نقشے پر علم وحکمت کا عظیم مرکز ثابت ہوا، حتی کہ خواندگی کی شرح ۹۵ فیصد کو پہونچ گئی تھی، جب کہ اس وقت یورپ اپنے تاریک ترین دور سے گذر رہا تھا۔ بیت الحکمت کی اس حیرت انگیز کامیابی کے پیش نظر پوری دنیا میں اس طرح کے تحقیقاتی ادارے قائم ہونے لگے، ہندوستان میں بھی علم وتحقیق کی اشاعت کے لئے بہت سے تحقیقاتی ادارے اور اکیڈمیاں وجود میں آئیں اور تاہنوز یہ سلسلہ جاری ہے، لیکن اس میں دو نام بہت اہمیت کا حامل ہے، دائرۃ المعارف حیدر آباد اور علامہ شبلی نعمانی کے خوابوں کی حسین تعبیر دار المصنفین اعظم گڈھ، ذیل میں دار المصنفین کا تعارف اور ان کی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

قیام اور پس منظر:

دار المصنفین کا خیال علامہ شبلی کے دل میں نہ جانے کب سے تھا، مگر اس کا پہلا اظہار انہوں نے مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی میں کتب خانہ کی ضرورت کے سلسلے میں کیا، اس اجلاس میں سید سلیمان ندوی نے بھی علامہ شبلی کے مشورے سے دار العلوم کی جدید عمارت میں کتب خانہ کی ضرورت پر تقریر کی، جس میں انہوں نے دار المصنفین کے قیام کی تجویز پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"کتب خانہ کے سواء ایک وسیع کمرہ ارباب قلم ومصنفین کے لئے بنایا جائے، جس میں قوم کی ایک جماعت تصنیف وتالیف میں مشغول ہوں اور اس عمارت کا نام دار المصنفین ہو"(۱)

یہ منصوبہ ابھی زیر غور تھا کہ ندوۃ العلماء میں شبلی کی مخالفت شروع ہوگئی، جس سے بددل ہو کر شبلی نے ندوۃ کو خیر آباد کہہ دیا، لیکن دار المصنفین کے قیام کا منصوبہ سرد نہیں پڑا تھا، بلکہ اس کے جائے وقوع کے سلسلے میں غور وغوض شروع ہوگئی، شبلی ندوہ میں ہی دار المصنفین قائم کرنا چاہتے تھے، لیکن حالات اس کے موافق نہ تھے، چنانچہ مولانا مسعود علی ندوی کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"بھائی وہ لوگ دار المصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں، میری اصل خواہش یہی ہے، لیکن کیا کیا جائے، حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے"(۲)

مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی نے دار المصنفین کے لئے اپنے وطن حبیب گنج کو پیش کیا تو شبلی کی رگ ایثار پھڑک اٹھی اور محبت بھرے لہجہ میں شیروانی صاحب کو لکھا کہ:

"آپ دار المصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو میں اعظم گڈھ کو کیوں نہ پیش کروں، اعظم گڈھ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کر سکتا ہوں"(۳)

بالآخر شبلی نے اپنی موروثی جائداد میں ہی دار المصنفین کی بنیاد رکھ دی، تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا، لیکن ابھی وقف نامہ ہی زیر تحریر تھا کہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو دار المصنفین کی تکمیل کی حسرت لئے ہوئے قوم کا نیر تاباں غروب ہو گیا، شبلی نے دار المصنفین کا جو خاکہ تیار کیا تھا، شبلی کے شاگرد باتوفیق بالخصوص سید سلیمان ندوی نے اس کی تعمیر اور شبلی کے تمام کاموں کی تکمیل کا تہیہ کر لیا، شبلی کی وفات کے تین دن بعد، جاں نثاران شبلی سر جوڑ کر بیٹھے

اور حمید الدین فراہی کی دعوت پر ''اخوان الصفا'' کے نام سے پانچ افراد پر مشتمل ایک مجلس تاسیسی قائم ہوئی، جس کے ارکان یہ تھے، مولانا حمید الدین فراہی رئیس مجلس، سید سلیمان ندوی ناظم، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا شبلی متکلم ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی اس وقت دکن کالج پونہ میں پروفیسر تھے، وہ استعفیٰ دے کر اعظم گڈھ آگئے، مولانا عبد السلام ندوی نے کلکتہ کو خیر آباد کہہ کر اعظم گڈہ کا رخ کیا، مولانا مسعود علی ندوی نے بھی ان دونوں کی معیت میں مزار شبلی کے پہلو میں باقی زندگی گذارنے کا فیصلہ کیا، یہی عارضی مجلس ''اخوان الصفا'' گویا دارالمصنفین کا نقطۂ آغاز ہے۔

شبلی کے باغ وبنگلے کے وقف کی تکمیل اور آمدنی کی ابتدائی صورت پیدا ہوجانے کے بعد ۲۵ رمئی ۱۹۱۵ء کو دارالمصنفین کا پہلا اجلاس ہوا، جس میں حسب ذیل افراد کو دارالمصنفین کا رکن اساسی منتخب کیا گیا:

صدر: مولانا حمید الدین

ناظم: مولانا سید سلیمان ندوی

منیجر: مولانا مسعود علی

رکن: حامد نعمانی ابن شبلی

رکن: مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی

رکن: نواب سید علی خان لکھنؤ

رکن: پروفیسر شیخ عبدالقادر (پونہ)

رکن: مولانا عبداللہ عمادی

رکن: نواب عماد الملک

رکن: سید حسین بلگرامی، حیدرآباد

رکن: مولانا عبدالماجد دریابادی

نظمائے دارالمصنفین:

دارالمصنفین کے سو سال پورے ہورہے ہیں، اس صد سالہ عہد کی کامیابی اور نیک نامی ان کے معماروں کی بلند حوصلگی اور علمی قابلیت کی بنیاد پر ہے، شبلی کے بعد دارالمصنفین کے پہلے ناظم سید سلیمان ندوی ہیں، جنھوں نے تقریبا تیس سال تک دارالمصنفین کو خون جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا، ان کے بعد شاہ معین الدین ندوی، اس کے ناظم منتخب ہوئے، جو تقریبا پچاس سال تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے، اور تقریبا اٹھائیس سال تک دارالمصنفین کے ناظم رہے، ان کے عہد میں بھی دارالمصنفین نے بھی خوب ترقی کی منزلیں طے کیں، ان کے علاوہ ان کے نظماء میں صباح الدین عبدالرحمٰن، عبدالسلام قدوائی، (شریک ناظم) مولانا ضیاء الدین اصلاحی، اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی شامل ہیں۔

اراکین دارالمصنفین:

دارالمصنفین کے موجودہ اراکین میں سابق سائب صدر جمہوریہ عالی جناب حامد انصاری صدر، جناب سید حامد نواب ریاض الرحمٰن خان شیروانی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سعید محمد مجددی، مولانا تقی الدین ندوی، مرزا امتیاز بیگ، ڈاکٹر سلمان سلطان، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ظفر الاسلام خان، ظفر الاسلام اصلاحی، عبد المنان ہلالی، اور ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی شامل ہیں۔

مقاصد:

دارالمصنفین اپنے قیام کے وقت سے ہی اپنے مقاصد کی حصولیابی میں مصروف ہے، سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کو بہت جلد عالمی سطح پر متعارف کرادیا، دارالمصنفین کے قیام کے مقاصد وہی تھے جو بیت الحکمت بغداد کے قیام کا تھا، ''دارالمصنفین کی تاریخی خدمات'' کے دیباچہ میں اس کے مقاصد کو ان الفاظ میں تعبیر کیا گیا ہے:

(۱) ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا

(۲) بلند پایہ کتابوں کی تصنیف وتالیف اور ترجمہ کرنا

(۳) ان کی اور دیگر علمی ادبی کتابوں کی طبع واشاعت کا

انتظام کرنا

آج دارالمصنفین کی خدمات کے مطالعہ کے بعد پوری دیانتداری کے ساتھ یہ اعتراف کیا جاسکتا ہے کہ دارالمصنفین اپنے مقاصد کی حصولیابی میں بہت حد تک کامیاب ثابت ہوا ہے۔

دارالمصنفین کی علمی مملکت:

دارالمصنفین میں دارالتصنیف ، درالاشاعت، دارالطباعت، شعبہ رسالہ معارف، دار الکتب جیسے اہم شعبے خدمات انجام دے رہیں، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کی بیش بہا کتابیں اور نادر مخطوطات موجود ہیں، عربی مخطوطات میں کتاب الجمل، شرح نہج البلاغۃ، کتاب المیز ان، احیاء العلوم اور فتاویٰ عالمگیری، اور فارسی مخطوطات میں اکبر نامہ، مونس الارواح، سر اکبر، روضۂ تاج محل، کلیات کلیم، ظفر نامہ امیر تیمور، تاریخ فرشتہ، قصص العجائب، تزک جہانگیری، سفینۃ الاولیاء، تذکرہ مخزن الغرائب، مرآۃ العالم، فرنگ جہانگیری، کلمۃ الحقائق، مدارج النبوۃ قابل ذکر ہیں۔(۴)

ماہنامہ معارف:

معارف کے اجراء کا خیال شبلی کے ذہن میں علی گڈھ کے قیام کے دوران ہی ہوگیا تھا، لیکن کسی وجہ سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، جب شبلی نے دارالمصنفین کا خاکہ تیار کیا تو اس میں ایک علمی رسالہ کا اجراء بھی شامل تھا، شبلی نے اس کا نام معارف اور اس کے اغراض مقاصد کا خاکہ بھی تیار کردیا تھا، شبلی کی ناگہانی وفات کی وجہ سے ان کی زندگی میں یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، مگر جب ان کے لائق شاگرد سید سلیمان ندوی نے اپنے استاذ کی وصیت کے مطابق ان کے علمی خوابوں کی تکمیل کا بارگراں اٹھایا تو دارالمصنفین کے ساتھ اس علمی رسالہ کے اجراء کی بھی فکر دامن گیر ہوئی، اور تقریبا ڈیڑھ، پونے دو سال بعد جب دارالمصنفین نے جون ۱۹۱۶ء میں اپنا پریس قائم کیا، تو شبلی کا یہ دیرینہ خواب سید صاحب کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچا، معارف کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۱۶ء میں نکلا، یہ رسالہ دارالمصنفین کا علمی ترجمان ہے، اس مقاصد وہی ہیں جو خود دارالمصنفین کے قیام کا ہے، سید صاحب نے معارف کے پہلے شمارے میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ معارف کے اجراء ،اس کے اغراض ومقاصد اور اس کے لائحہ عمل پر روشنی ڈالی ہے، پہلے اداریے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''حضرت الاستاذ علامہ شبلیؒ دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ معارف نام کے ایک ماہوار علمی اور دینی رسالہ کا تخیل بھی رکھتے تھے، حاشیہ نشینان بساط شبلی نے اس محسن کی یاد میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی بساط بھر ان کی تمام تحریکوں کو زندہ رکھیں گے، دوسال کی گذشتہ مدت دارالمصنفین کے قیام وتاسیس میں صرف ہوگئی، اب جب ادھر سے اطمینان ہوا تو دوسرے فرائض یاد آئے، اس میں معارف کا اجراء بھی تھا، ہم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک ایک خاص علمی رسالہ کی اعانت کے لئے کہاں تک تیار ہے، تاہم ہر شخص اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے۔

۱۹۱۶ء سے آج تک یہ رسالہ انتہائی پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے، جب کہ اس دوران سیکڑوں رسالے نکلے اور حوادث کی نظر ہوگئے، ڈاکٹر نعیم صدیقی نے ''سید سلیمان ندوی شخصیت اور ادبی خدمات'' میں معارف کے سلسلہ میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

درالمصنفین کی گولڈن جبلی:

۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی گولڈن جبلی منائی گئی، جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین خان صدر جمہوریہ ہند نے کی، اس موقعہ پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنا قیمتی صدارتی خطبہ دیا تھا، جس میں انہوں نے دارالمصنفین کی عظیم الشان خدمات کا اعتراف کیا تھا، اس کے بعد ہی حکومت ہند کے چند نمائندے دارالمصنفین آئے اور یہ پیش کش کی کہ دارالمصنفین کو سرکاری سرپرستی میں دیدیا جائے، لیکن اس وقت کے ناظم شاہ معین الدین نے اسے سلب آزادی کے مترادف تصور کرتے ہوئے انکار کردیا۔(۵)

یہی پیش کش خدا بخش لائبریری پٹنہ اور رضا لائبریری رامپور کو بھی کی گئی، تو ان دونوں اداروں نے یہ پیش کش قبول کر لی، چنانچہ یہ دونوں ادارے آج حکومت کی تحویل میں ہیں۔

دارالمصنفین کے ممتاز اہل قلم:

دارالمصنفین کے قیام کا مقصد ہی اہل قلم کی تربیت کرنا ہے، واقعہ یہ ہے کہ دارالمصنفین نے پچاس سے زائد اہل قلم کی تربیت کا فریضہ انجام دیا ہے، جن کے گوہر قلم کے در نایاب نے علمی لائبریری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، ان میں چند ممتاز نام یہ ہیں:

سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین ندوی، عبدالباری ندوی، ریاست علی ندوی، ابوظفر ندوی، صباح الدین عبدالرحمن، ابوالحسنات ندوی، سعید الانصاری، مجیب اللہ ندوی، اویس نگرامی، عمیر الصدیق ندوی، یوسف کوکن، عبد السلام قدوائی، شاہ نصر احمد پھلواروی، محمد منصور نعمانی، ڈاکٹر نعیم صدیقی۔

دارالمصنفین کی علمی خدمات:

دارالمصنفین ایک ادارہ نہیں ایک تحریک ہے، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ دارالمصنفین کی خدمات ہمہ جہت ہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ علمی میدان میں ان کی خدمات انتہائی درخشاں ہیں، معارف کا اجراء اور اس کا اس تسلسل کے ساتھ جاری رہنا آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے، دارالمصنفین نے اہل قلم کی جماعت تیار کر کے علمی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے، دارالمصنفین سے شائع ہونے والی علمی اور تحقیقی کتابیں ان سب پر مستزاد ہیں، دارالمصنفین میں جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اس میں سیرت نبوی، سوانح وتذکرہ، حدیث وفقہ، تصوف، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، فلسفہ، سائنس، علم الکلام، اردو ادب اور تاریخ اردو ادب وغیرہ شامل ہیں، دارالمصنفین سے بعض اہم کتابوں کا ترجمہ کرایا گیا ہے، اور زیادہ تر مستقل تصنیف ہیں، اب تک تقریباً ڈھائی سو کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، سیرت کے موضوع پر سب سے پہلی کتاب سیرت النبی لکھی گئی ہے، جو سات جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی دو جلد علامہ شبلی کی ہیں، باقی جلدیں شاگرد رشید سید سلیمان ندوی کی ہیں، اس کے علاوہ سید سلیمان ندوی کی دو کتاب خطبات مدراس اور رحمت عالم سیرت کے موضوع پر طبع ہوئی ہیں، سیر صحابہ کی بارہ جلدوں کا عظیم الشان کارنامہ بھی دارالمصنفین کا ہی حصہ ہے، تاریخ اسلام کے سلسلے میں دارالمصنفین کا نمایاں کارنامہ ہے، جس کی ایک جھلک یہاں پیش کی جاتی ہے:

۱۔۴ تاریخ اسلام (چار جلدیں) از مولانا شاہ معین الدین ندوی، ۵۔۶ تاریخ دولت عثمانیہ (دو جلدیں) از ڈاکٹر محمد عزیر، ۷۔۸ تاریخ صقلیہ (دو جلدیں) ۹۔ تاریخ اندلس از ریاست علی ندوی، ۱۰۔ اسلام اور عربی تمدن، ۱۱۔ عرب کی موجودہ حکومتیں از مولانا شاہ معین الدین ندوی، ۱۲۔۱۳ تاریخ دعوت وعزیمت (دو جلدیں) از مولانا ابوالحسن علی ندوی، ۱۴۔ اسلام کا سیاسی نظام از مولانا اسحاق سندیلوی، ۱۵۔ ہماری بادشاہی از مولانا عبدالسلام قدوائی، ۱۶۔ عرب وہند تعلقات، ۱۷۔ عربوں کی جہاز رانی از سید سلیمان ندوی۔ (۶)

دارالمصنفین کی ان تاریخی تصانیف کو بڑی مقبولیت حاصل ہے، ہندو پاک کی مختلف یونیورسٹیوں میں نصابی ضرورت کے لئے یہ کتابیں بہت معاون ثابت ہوتی ہیں، مثلاً تاریخ اسلام، تاریخ اندلس، عرب وہند تعلقات، تاریخ دولت عثمانیہ، اسلامی کا سیاسی نظام وغیرہ، یونیورسٹی کی نصابی ضرورت کو بھی پورا کرتی ہیں، تاریخ کے باب میں دارالمصنفین کی خدمات سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں، بلا شبہ یہ دارالمصنفین کا امتیازی کارنامہ ہے، دارالمصنفین کی خدمات کے جائزے کے لئے بھی کئی کتابیں ترتیب دی گئی ہیں، اس میں ''دارالمصنفین کی تاریخی خدمات'' مطبوعہ خدا بخش لائبریری پٹنہ، ڈاکٹر الیاس اعظمی کی جس میں دارالمصنفین کی تاریخی خدمات کا مفصل جائزہ لیا گیا، بہت اہم ہے، اسی طرح ڈاکٹر خورشید نعمانی کی کتاب ''دارالمصنفین کی ادبی خدمات'' بہت چشم کشا ہے۔

سمینار اور کانفرنس:

دارالمصنفین کی خدمات کا باب یہ بھی ہے کہ دارالمصنفین کے ذریعہ مختلف موضوعات پر سمینار کا سلسلہ جاری ہے، حالات حاضرہ سے ہم آہنگ موضوعات کا انتخاب کر کے کانفرسوں کا انعقاد کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں فروری ۱۹۸۲ء میں ''اسلام اور مستشرقین'' کے عنوان سے ہونے والا بین الاقوامی سمینار کافی اہمت اور شہرت کا حامل ہے، پہلی مرتبہ اردو زبان میں استشراق و مستشرقین، اغراض ومقاصد، پس منظر اور مستشرقین کے مثبت اور منفی خدمات کا مفصل جائزہ دارالمصنفین کے ذریعہ لوگوں کے سامنے آیا، اس سے پہلے اگرچہ عربی اور انگریزی زبانوں مین یہ ذخیرہ موجود تھا لیکن اردو زبان میں اتنا بڑا ذخیرہ موجود نہیں تھا، دارالمصنفین کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ''استشراق و مستشرقین'' کی پانچ جلدیں شائع کیں، جس سے اردو قارئین کو استشراق کو سمجھنے میں بہت مدد ملی ہے۔

دارالمصنفین مشاہیر کی نگاہ میں:

دارالمصنفین غیر معمولی شہرت کا حامل ایک تحقیقی و تصنیفی ادارہ ہے، ہند و بیرون ہند کی مشہور شخصیات نے دارالمصنفین کا دورہ کیا ہے، اور یہاں کی علمی ماحول کی مدح سرائی کی ہے، اس ادارہ کی زیارت کرنے والوں میں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، راجندر پرساد، مہاتما گاندھی، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر ذاکر حسین، حسین احمد مدنی، ڈاکٹر مختار انصاری، بی اماں، مولانا ظفر علی خاں، جے پرکاش نارائن، جیسے مشاہیر علماء اور دانشوروں کے نام شامل ہیں، ان میں بعض عظیم شخصیتوں نے اپنے تأثرات بھی قلم بند کئے ہیں، عالم عرب کے مشہور عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں:

''میں نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی، مگر علم کی مملکت دارالمصنفین میں دیکھی، جس کے قلم رو میں اپنا کتب خانہ، اپنے رفقاء، اپنا پریس، اپنا دفتر، اپنا گھر اور اپنی مسجد ہے، اور یہ سب ایک احاطہ میں محدود ہے''(۷)

مولانا آزاد تو یہاں تک کہہ گئے:

''یہاں کا اعزازی فیلو ہونا عمدہ بات ہے، اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو تب بھی منظور کرلوں گا''

ڈاکٹر ذاکر حسین کی رائے ہے کہ:

''دارالمصنفین اعظم گڈھ ایک سراج منیر ہے ـــــ اس کی گراں قدر علمی اور ادبی خدمات نے بلا واسطہ ہندوستان اور بالواسطہ ساری دنیا کے تہذیبی سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا ہے ـــــ اس مکتب کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات یونانی ایرانی، ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں، وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے، اور ''قصۂ سکندر و دارا'' سنانے پر ''حکایات مہر و وفاء'' بیان کرنے کو ترجیح دی ہے''(۸)

مولانا عبدالماجد دریابادی سیاحت ماجدی میں لکھتے ہیں:

''دارالمصنفین شبلی کے دماغ کی پیداوار، سید سلیمان ندوی کی ساری عمر کی علمی کاوشوں کی یادگار، مسلم ثقافت کے چمن کی بہار، ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں سے مسلم وشاندار ہے''(۹)

حواشی وحوالہ جات

(۱) سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے، ص:۱۰۰

(۲) مکاتب شبلی حصہ دوم، ص:۱۲۷

(۳) سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے، ص:۱۰۰

(۴) شبلی کی علمی مملکت

(۵) شاہ معین الدین ندوی حیات وخدمات

(۶) دارالمصنفین کی تاریخی خدمات ص:۳۵۶

(۷) دارالمصنفین کی تاریخی خدمات، ص:۳۵۳

(۸) شبلی کی علمی مملکت

(۹) سیاحت ماجدی، ص:۸

عدل جہانگیری

علامہ شبلی نعمانیؒ

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر
ایک دن نور جہاں بام پر تھی جلوہ فگن

کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آنکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن

غیرت حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتہ بے گوروکفن

ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیظ سے آگئی ابروے عدالت پہ شکن

حکم بھیجا کہ کنیزان شبستان شہی
جاکے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوت حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئین حسن

ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ ناموس حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن

اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشور حسن میں جاری ہے یہی شرع کہن

مفتی دین سے جہانگیر نے فتوی پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن

مفتی دین نے بے خوف وخطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن

لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن

ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جاکر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن

پھر اسی طرح اسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہ زمن

اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جانے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ انداز غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن

اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغان چمن

ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بے کس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمت شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امر حسن

مفتی شرع سے پھر شاہ نے فتوی پوچھا
بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ وزن

وارثو ں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ہوچکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبہ حیلۂ وفن

اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکف بیت حزن

دفعتہً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من؟

ڈاکٹر قاری محمد نصیر الدین منشاوی۔ حیدرآباد

علامہ شبلی نعمانیؒ کی ادبی خدمات

شبلی نعمانی اردو زبان وادب کی ایک ناقابل فراموش شخصیت ہیں، ان کی تصانیف اور مقالات نے اردو نثر کی علمی حیثیت ک بلند اور مستحکم کیا، شبلی کی ادبی خدمات متنوع اور گونا گوں ہیں، تاریخ، سوانح، سیرت اور علم کلام وغیرہ سے متعلق، ان کی تحریریں ہمیشہ یادگار رہیں گی، مولانا کی نثر میں ایک خاص طرح کی شیرینی اور دلکشی پائی جاتی ہے، شاعری کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بلند ہے اور شاعری خصوصاً نظموں کے موضوعات مختلف اور ندرت لیے ہوئے ہیں، مثلاً اہل بیتِ رسول کی زندگی، عدل فاروقی کا ایک نمونہ، نظام حکومتِ اسلام، عدل جہانگیری وغیرہ وغیرہ علاوہ ازیں سیاسی موضوعات پر بھی مولانا شبلی کی کئی نظمیں ہیں، مثلاً ''ترکوں سے خطاب''، ''ممبئ کی وفادار انجمن''، ''مسلم لیگ''، ''ہم کشتگارانِ معرکہ کانپور ہیں''، ''آپ ظالم نہیں زنہار یہ ہیں مظلوم''، ''ہمارا طرز حکومت اور ایک مثنوی بھی لکھی ہے جو کافی مقبول ہوئی ''مثنوی صبح امید''۔

شبلی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور علمی وفکری ہر سطح پر قدیم وجدید کی آمیزش کے داعی اور نقیب تطے، مولانا کا بچپن بہت ناز ونعم میں گزرا، فطرتاً ذہین تھے اور حافظہ بھی قوی تھا، مولانا کی والدہ مذہبی تھیں اور مولانا شیخ حبیب اللہ صاحب فارسی کے عالم تھے، مولانا شبلی رات رات جاگ کر مطالعہ کرتے تھے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر اور پایہ کے ادیب تھے، وہ ہندستان کے امام الادب بھی کہلاتے تھے، پروفیسر صاحب کا سب سے بڑا فیض قرآن پاک کی معجزانہ فصاحب وبلاغت کی نکتہ چینی شناسی تھا اسی اصول پر قرآن پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ اپنے خالص طالب علموں کو پڑھاتے تھے اور فصاحب وبلاغت کے نکتے بتاتے تھے، مولانا شبلی میں یہ ذوق اخیر تک رہا۔

تاریخ کے بارے میں بڑے وثوق سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ''یہ تمام فنی اور سائنسی علوم میں قدیم ترین علم ہے، تاریخ کا اہم ترین تقاضہ غیر جانبداری ہے، شبلی کی تاریخ نویسی کے فن کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کیا تصانیف کی ضخامت، کیا کیفیت، کسی بھی اعتبار سے ان کا مرتبہ کم نہیں، مولانا شبلی بلاشبہ ایک بڑے مورخ تھے اور ایک بڑے مورخ کہ جنہوں نے کہیں بھی فنی ضروریات اور متقاضیات کو نظر انداز نہیں کیا، شبلی کی تاریخ نویسی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی بے مزگی یا بے کیفی میں مبتلا نہیں ہونے دیتے، جا بجا وہ ایک قصہ گو کی طرح ایسے ایسے دلچسپ قصے سناتے جاتے ہیں کہ واقعات کا تسلسل بھی ختم نہیں ہوتا اور اس میں خشکی و بے کیفی بھی نہیں رہتی اور قاری کی اکتاہٹ بھی دور ہو جاتی ہے، شبلی تاریخ اور تحقیق کو لازم وملزوم جانتے ہیں، ان کے نزدیک تاریخ نویسی کا تصور تحقیق کے بغیر ناممکن ہے، تحقیق کے لیے انہوں نے ہمیشہ دو وسائل اختیار کیے ہیں ایک روایت اور دوسرا درایت، انہی دو اصولوں کی مدد سے وہ سچ اور جھوٹ کی پہچان کرتے ہیں۔

پامر نے اپنی کتاب ''ہارون رشید'' میں ایک جگہ لکھا ہے''ہارون رشید کے بے ہودہ درباریوں نے یہ بات ان کے ذہن نشین کردی تھی بلکہ پیرو اسلام اس بات کو اس وقت اور کچھ مسلمان اب بھی سمجھتے ہیں کہ کافر خدا کی مخلوق ہی نہیں کہلا سکتے، شبلی نے اس الزام کو قطعی غلط ٹھہراتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو مسلمان اپنی حکومت کے زمانے میں ہزاروں لاکھوں چرچوں اور گرجوں کی حفاظت کے معاہدے کیوں لکھتے اور عمر بن عبدالعزیز کو کیوں تسلیم کیا جاتا جنہوں نے ولید کے گرائے ہوئے ایک گرجے کو مسجد کا کچھ حصہ ڈھا کر دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی، آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ ''خاص دولت عباسیہ کے عہد میں دارالخلافہ بغداد میں سینکڑوں ہزاروں گرجے تعمیر ہوئے جہاں نہایت آزادی سے ہر قسم کی مذہبی رسوم ادا کی جاسکتی تھیں، بقول ان کے تاریخ کے ہر صفحہ پر مسلمانوں کے بے تعصبی کی شہادت ملے گی، کیا ان سب باتوں کو دیکھ کر پامر کے لگائے ہوئے الزام کو درست قرار دیا جاسکتا ہے؟

بہرحال تاریخ اور تحقیق کا موضوع بہت طویل ہے، سرسید احمد خاں کی تحریک پر محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے سالانہ منعقدہ ڈسمبر ۱۸۸۷ء کے موقع پر مولانا شبلی نے اپنا پہلا مقالہ ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' کے عنوان پر لکھا اور اسے خوب تر بنانے کی کوشش کی بقول مولانا سید سلیمان ندوی مولانا شبلی کے اس مقالے سے ہی مولانا کی شہرت کا آفتاب پہلی دفعہ طلوع ہوا، مقالے کی خوبیوں کا اندازہ تو اس کے مطالعہ ہی سے لگایا جاسکتا، اس مقالے کے چند عنوانات ہیں، ''قرآن کا عرب کے فنِ انشاء پر اثر'' ،دفعہ،فرائض،علم الکلام، حدیث،علم الرجال،علم نحو،عہد صحابہ کے علماء،علم البیان، النہیات اور قرآن،عیسائی مترجمین،منصور عباسی کا عہد،ہارون رشید کا عہد،مامون الرشید کا عہد،طرز تعلیم، قدیم تعلیم، اسلامی مدرسے،یورپ میں اسلامی مدرسے، وغیرہ وغیرہ،مولانا شبلی کی تصنیفی صلاحتیں پہلی بار اس مقالے میں پوری قوت وتوانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوئیں۔

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم کے بعد مولانا کا دوسرا معرکتہ الآراء مقالہ ''الجزیہ'' ہے جس کی شہرت دور دور تک پھیلی، سرسید نے تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے''جزیہ'' کا ایسا بے جا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آج تک کسی نے ایسی عمدگی سے حل نہیں کیا تھے۔

کتب خانہ اسکندریہ:

یورپین مصنفین کے متعصبانہ انداز فکر اور جارحانہ بیانات نے مولانا شبلی میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب کی آگ ہمیشہ، سینوں میں دبی رکھتے ہیں، چنانچہ مولانا نے جب بھی مسلمانوں کی علمی وتہذیبی فتوحات کو اپنی تصانیف کا موضوع بنادیا وہیں ان پر عائد کئے گئے الزامات واعتراضات کے ازالے کی جانب بھرپور توجہ کی، کتب خانہ اسکندریہ بھی اسی سلسلہ کا ایک محققانہ مقالہ ہے، جس میں انہوں نے مسلمانوں پر اس کتب خانے کے جلائے جانے کے الزام کی تردید کی ہے، مختلف وجوہ کی بنا پر مولانا کے تاریخی مقالوں کے درمیان اسے شاہکار کا درجہ حاصل ہے، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ موضوع زیر بحث سے متعلق یورپین یا عیسائی مصنفین کی تمام قابل ذکر تحریریں جو جرمن، فرنچ یا انگلش میں تھیں ایک ایک کرکے ان کی نگاہ سے گزر چکی تھیں، اس لیے فریق مخالف کے دعوؤں کی تردید اور اپنے مدعا کے اثبات میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی ایک ایک سطر سے خاص اعتماد جھلکتا ہے۔

المامون:

یہ مولانا شبلی کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے جو ۱۸۸۸ء میں منظر عام پر آئی، مولانا شبلی نے تاریخ کی طرح سوانح کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں، وہ حالی کے بعد اردو کے دوسرے بلند پایہ سوانح نگار مانے جاتے ہیں لیکن

کثرت معلومات تحقیق وتدقیق، حسن انتخاب اور زبان وبیان کی شگفتگی، دل آویزی کے لحاظ سے شبلی، حالی کی بہ نسبت بہتر سوانح نگار ہیں، المامون کہنے کو تو یہ مشہور عباسی خلیفہ مامون الرشید کی سوانح عمری ہے لیکن درحقیقت یہ صرف سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ متعلقہ عہد کی تہذیبی وتمدنی تاریخ بھی ہے پہلے حصہ میں اسلام میں خلافت کا سلسلہ کیوں کر قائم ہوا اس کی وضاحت کی گئی ہے دوسرے حصہ میں سلطنت کے انتظام مملکت کی آمدنی،فوجی انتظام علامتیں اور اس سے متعلق جزئیات وغیرہ جہاں جہاں سے ملیں چن چن کر ایک جگہ جمع کردی ہیں۔

سیرۃ النعمان:

مولانا شبلی، امام ابوحنیفہ کے پیرو تھے، اس سیرت میں نعمان بن ثابت (امام ابوحنیفہ) کی زندگی کے حالات وواقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، پہلے حصہ میں حالات زندگی اور دوسرے حصے میں علم العقائد حدیث اور فقہ پر امام صاحب کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی، مولانا حالی نے اس سیرت کی بے حد تعریف کی ہے۔

الفاروق:

مولانا شبلی کی ادبی خدمات میں ایک اور اضافہ خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطاب کی زندگی پر ایک کتاب ہے جس میں حضرت عمرؓ کی نہایت مستند، مفصل اور مکمل سوانح حیات کا احاطہ کیا گیا، تمام تصانیف میں اس کی حیثیت، بیت الغزل، کا درجہ رکھتی ہے، مقدمہ میں اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار اور خصوصیات پر بحث کی گئی ہے نیز یوروپین مورخوں کی بے اعتدالیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس کتاب میں حضرت عمر کے قبول اسلام اور ہجرت سے لے کر فتوحات کا ذکر ہے انتظام سلطنت، حکومت کی نوعیت، جمہوریت، ملک کی تقسیم، ملکی عہدہ داروں اور ان کے فرائض ان کا مشاہرہ، انسداد رشوت، صیغہ محاصل، عدالت کی جزئیات پولیس اور فوج کے محکموں کا بھی ذکر ہے۔

الغزالی:

مولانا شبلی نے یہ کتاب حیدرآباد کی ملازمت کے زمانے میں ۱۹۰۱ء میں تصنیف کی، اس کتاب میں امام غزالی کی سوانح اور ان کے نظریات وافکار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی طرح سوانح مولانا روم لکھ کر بھی شبلی نے بڑی ادبی خدمت کی ہے، مثنوی مولانا روم سے کلامی مسائل کا استنباط کیا گیا ہے، مولانا شبلی کی سب سے بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک پر جامع اور پراثر تصنیف کی ہے، یہ کئی حصوں میں لکھنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن صحت ساتھ نہ دے سکی، پھر بھی انہوں نے تقریباً مکمل سیرت پر بہت بڑا کام کیا ہے، دراصل یوروپین مصنفین نے سیرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی پہلوؤں کو توڑ مروڑ کر اور گھما پھرا کر پیش کیا تھا، جس سے مسلمانوں کا نوجوان طبقہ طرح طرح کے شکوک وشبہات کا شکار ہونے لگا تھا، تب مولانا شبلی نے اس کے جواب میں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم تصنیف کی، جس میں تمام شکوک وشبہات کا تشفی بخش ازالہ ہوگیا۔

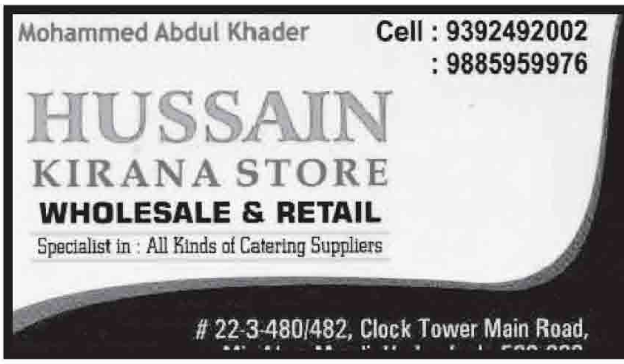

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

علامہ شبلی نعمانیؒ کی شخصیت اور ذوقِ مطالعہ

مولانا شبلی کا بچپن اور شباب بہت ہی آسودگی میں گزرا۔ علمی صلاحیت حاصل کی پوری صالحیت کے ساتھ، وہ بڑی صحبتوں اور فضول مشغلوں سے کوسوں دور تھے۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اخلاق وکردار کی برکت انھیں اپنی والدہ ماجدہ کی بدولت حاصل ہوئی۔ کبھی وہ مصیبت میں گرفتار ہوئے اور حالات نے ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تو اس صورت میں بھی مولانا نے معصیت نہیں اختیار کی، پریشانیوں کو صبر وتحمل سے برداشت کیا اور خودداری اور خوداعتمادی کے دامن کو نہیں چھوڑا یہ ان کے مزاج اور سرشت میں داخل تھا کیوں کہ وہ ایک راج پوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے، امرا ورؤسا چاہے وہ علی گڑھ میں ہوں، حیدرآباد یا لکھنو میں ہوں کبھی انھوں نے اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا، ساری زندگی اپنے قلم کو آلودہ ہونے نہیں دیا اور کبھی شکست کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ مولانا مزاجاً اور فطرتاً بہت ہی خوددار تھے، اگر کوئی کام خودداری کے خلاف کرنا پڑتا تو بہت ہی رنجیدہ ہوجاتے حیدرآباد سے ایک خط نواب محسن الملک بہادر کو تحریر فرماتے ہیں:

''مولوی صاحب! روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ اور کسی کو نہیں میں کچھ ابراہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں، میرا رُواں رُواں دنیا کی خواہشوں میں جکڑا ہوا ہے، لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، درباداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہوسکتی اور بغیر اس کے کامیابی معدوم اس لیے میں نے گوشہ عافیت پسند کیا۔'' (بحوالہ مکاتیب شبلی، ص:۷)

ان جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ خودداری کی وجہ سے انھوں نے ملازمت کو خیرباد کیا کیوں کہ ملازمت کی صورت میں امرا کی جی حضوری ضروری تھی اور مولانا شبلی اپنی حیثیت سے اپنے مزاج کے مطابق خود کلاہ دار تھے۔۔۔ مولانا شبلی میں خودداری کے ساتھ استغنا اور بے نیازی بھی تھی اور یہی اسلاف کا شیوہ رہا ہے کہ ان کے دل میں دنیاوی عیش وعشرت کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی چناں چہ مولانا شبلی کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مالداروں اور امرا اور انگریزوں کی سوسائٹیوں اور ان کی صحبت اختیار کرلینے کے بعد بھی ان کی زندگی سادگی سے بسر ہوئی مختصر سامان اور مختصر کپڑے لکھنے پڑھنے، کے سامان کے سوا ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ خط میں لکھتے ہیں:

''گھر کے مصائب نے یہاں تک پہنچا دیا ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا۔۔۔ (بحوالہ مکاتیب شبلی، ص:۱۰۲)

ان دو سطروں میں مولانا نے استغنا اور بے نیازی اور دولت کی ہوس کس انداز سے ناپسند کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ میرا گھر مجھے عزیز ہے امرا کے محلوں سے۔ اگر کوئی مولانا کے اوپر احسان کر دیتا تو مولانا اس کے بدل کے لیے بے چین ہوجاتے سفر قسطنطنیہ میں حسین آفندی نے مولانا کا خاص خیال رکھا اور مولانا کی خدمت میں اور رہبری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس سے سبک

دوش ہونے کے لیے اپنے والد کو خط لکھا:
''نظام آباد کا عمدہ قسم کا برتن، یا لکھنو کا چکن مگر نہایت عمدہ فروی بوٹیاں ہوں تیس روپیہ سے کم قیمت کا نہ ہو، یہ بھی نہ ہوتو مراد آباد کا برتن مگر نہایت عمدہ غرض کوئی نادر چیز ضرور بھیجئے۔'' (مکاتیب شبلی)

احسان کے بدلے کو ادا کرنے کے لیے مولانا نے اس خط میں جو جملے لکھے قابل غور ہیں کہ ہر جملے میں فرمایا نہایت عمدہ اس سے مولانا کے مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حیدرآباد کے وظیفہ کے سلسلہ میں بعض احباب کا احسان اٹھایا لیکن اس کے علاوہ انھوں نے اپنی خودداری و بے نیازی کی وجہ سے کسی کو اپنے اوپر احسان کرنے کا موقع ہی فراہم نہیں کیا۔

مولانا میں خودداری کے ساتھ خاک ساری بھی تھی، ہر قسم کے لوگوں سے میل جول رکھتے تھے طلبا اور مریض کی عیادت میں بہت ہی بے تکلف تھے۔ مولانا نرم طبیعت اور رقیق القلب تھے۔ ایک دفعہ شہر اعظم گڑھ جارہے تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ وہ بہت ہی رو رہا ہے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس غریب کاشت کار کا بیل مرگیا ہے مولانا نے فوراً دس روپیہ نکال کر دیا۔ فرمایا کرتے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص فاقہ سے ہے تو میں کھانا کا نوالہ اپنے منھ میں ڈال ہی نہیں سکتا، دلی چوٹ پر تھوڑی ہی دیر میں آنکھوں سے برسات ہو جاتی۔ مولانا اپنے عزیز واقارب سے بہت محبت کرتے تھے، فرماتے تھے کہ کبھی والدہ یاد آجاتی ہیں تڑپ جاتا ہوں، بھائیوں سے بے مثال محبت تھی مہدی حسن کا انتقال ہوا تو اس غم میں ہفتوں تک بات چیت نہیں کی اور اسحاق کی موت کے غم نے ان کی زندگی ہی کا خاتمہ کردیا۔ مولانا شبلی کے مزاج میں عصبیت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے شروعات میں متعصب حنفی تھے عربوں اور ترکوں اور تمام سلاطین اسلام سے ان کو گہرا قلبی لگاؤ تھا عمر فاروقؓ، مامون، جہانگیر اور عالمگیر پر جو الزامات لگائے گئے تھے اس کو درایت اور روایت کے ساتھ پوری شدت سے تردید کی اور اسلام اور مسلمانوں کو بدنامی کے داغ سے باہر نکالنے کی بھرپور سعی کی۔ کچھ لوگوں نے مولانا کے متعلق اخبارات میں رطب و یابس لکھا اور ان کی تصنیفات میں عیب اور نقص نکالا اور نکتہ چینی کی اور ان کی کتابوں پر رد لکھا لیکن مولانا نے اس کا جواب نہیں لکھا کیوں کہ مولانا نے جو اپنی رائے قائم کرلی تو اس کے اظہار میں کسی کی پروا نہیں کرتے اور اپنی رائے کو دلائل سے مزین کر کے پیش کرتے تھے اگر کوئی اس کے خلاف دلیل لاتا تو اس کا مناسب رد کرتے اور سچائی کے مقابلے میں عوام کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے فرماتے تھے کہ ''میں کب چاہتا ہوں کہ تمام دنیا مجھ سے خوش رہے''، مولانا شدید الاحساس اور ذکاوت حس جیسی خوبیوں سے مالامال تھے اور یہی چیز ان کی شخصیت کو ممتاز کرتی ہے اور اسی قوت نے ان کو شاعر پرجوش مقرر اور ایک قومی مصلح بنایا تھا۔ مولانا کا ذہن فطرتاً تعمیری تھا، سفارش اچھی چیز ہے مگر بے محل بہت ہی مضر ہے، فرمایا کرتے تھے کہ جھوٹی سفارش کر کے ایک کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے اور سیکڑوں کا نقصان۔

مولانا شبلی سچائی اور راست بازی کو پسند کرتے تھے، غیبت، حکایت و شکایت سے نالاں ہو جایا کرتے تھے، اسی سچائی کی وجہ سے مولانا کے لیے وکالت کا پیشہ ناموزوں ہوا مولانا کی شخصیت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ مولانا وقت کی اہمیت کو سمجھتے تھے صبح سویرے اٹھنا، قرآن کی تلاوت کرنا، حماسہ کے اشعار گنگنانا، معمولات اور فرائض کو وقت پر ادا کرنا، لکھنے پڑھنے اور ملنے ملانے ہر ایک کے لیے وقت مقرر تھا اور یہ پروگرام استقلال کے ساتھ مرتے دم تک جاری رہا۔ ان کی طبیعت متضاد بھی تھی احباب کی صحبت ضروری اور تنہائی بھی لازمی لیکن سب کا وقت مقرر بمبئی کے بارے میں مولانا فرماتے تھے کہ یہاں شبلی پڑا پھرتا ہے اور کوئی جانتا بھی نہیں کہ یہ شبلی ہے۔ مولانا شبلی ہر وقت اور باسلیقہ اپنے امور کو انجام دیا کرتے تھے طبیعت میں نفاست و طہارت تھی کپڑے اگرچہ بہت اعلیٰ معیاری و قیمتی نہیں پہنتے تھے لیکن نفاست اور صفائی سے پُر ہوتا تھا، جہاں رہتے تھے باوجود سادگی کے نہایت صاف و شفاف کمرہ رہتا کھانے کی خوبی کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ خوش ذائقہ ہو، بلکہ یہ بھی لازمی تھا کہ خوش رنگ ہو اور سلیقہ کے ساتھ دسترخوان پر چنا

جائے۔اسی سلیقہ کی وجہ سے لکھنو کی تہذیب وتمدن کو دلی کی تہذیب و تمدن پر ترجیح دیتے تھے۔ مولانا کھانے کے بہت شوقین تھے امرا کی طرح وہ مرغن اور متنوع، لذیذ غذاؤں کے دلدادہ نہ تھے، فرماتے تھے کھانے کی عمدگی کے یہ معنی ہیں کہ عمدہ پکا ہوا ہو۔ میں عمدہ پکی ہوئی دال کھاسکتا ہوں اور برا پکا ہوا گوشت نہیں کھاسکتا، کھانے میں تیز نمک پسند کرتے تھے، میٹھے کے ساتھ اس کے حق سے بھی زیادہ کھاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ شیرینی کے لیے صرف میٹھا ہونا کافی ہے رساول بہت شوق سے کھاتے تھے۔ مصری کے ڈلے چبایا کرتے تھے شکران کے ساتھ ہر وقت رہتی تھی، جب بھی موقعہ ملتا شکر کے دانوں کو کھایا کرتے تھے چائے وہ دن رات میں کئی دفعہ پیتے تھے فصل میں آم شوق سے کھایا کرتے تھے اچھے اور تازہ گھی کے شوقین تھے پانی ہمیشہ ٹھنڈا پسند کرتے تھے، اخیر میں تو صرف توس ہی کھایا کرتے تھے مگر میٹھا کھانا انھوں نے نہیں چھوڑا، بیماری کے عالم میں بھی بہ شوق شکر کھایا کرتے تھے، اس کا اثر ان کی تحریروں اور تقریروں میں پایا جاتا ہے۔ مولانا پر کشمکش کا دور بھی گزرا ہے، اس دور میں مولانا کا دماغ ضرور پریشان ہوا مگر دل ہمیشہ مطمئن کبھی کبھی تحمل و برداشت کا مادہ ختم ہوجایا کرتا تھا۔ مگر جلدی ہی سنبھل جایا کرتے تھے۔ مولانا کی زندگی میں لوگوں نے مولانا سے علمی وفکری اختلاف ضرور کیا ہے لیکن ان کے اخلاق وکردار پر کسی نے انگشت نمائی نہیں کی ہے۔

مولانا کے انتقال کے بعد کچھ ناقدین نے ان کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے اوپر عشق و عاشقی اور نرگیست ورومانیت کا الزام لگایا ہے اور اس کو ان لوگوں نے خطوط شبلی کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۱۷/ فروری ۱۹۰۸ء سے ۲۸/ مئی ۱۹۱۱ء تک (۵۵) خطوط عطیہ بیگم کے نام اور (۱۷۴) خطوط ان کی بہن زہرا بیگم کے نام ہیں۔ مولانا شبلی کی دلی خواہش تھی کہ عورتیں پردے کو برقرار رکھتے ہوئے تعلیم حاصل کریں اور اس کی نشر واشاعت کریں اور قومی اور ملی کاموں میں حصہ لیں اس کے لیے اعلیٰ تعلیم اور روشن خیالی اور اعلیٰ ذوق کا مظاہرہ کرنا چاہیے، مولانا علی گڑھ میں انگریز عورتوں کی تعلیم وتہذیب سے متاثر تھے انھوں نے اسلامی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا اور عورتوں کو گھر سے میدان جنگ تک اور اخلاقی اور علمی اور عملی کردار کا جائزہ لیا تو ان کو موجودہ زمانہ میں یہ احساس ہوا کہ عورتوں کو بھی مناسب آزادی دے کر قوم وملت کے لیے کارآمد بنانا چاہیے۔ مولانا شبلی کی جب ملاقات عطیہ فیضی سے ہوئی اور ان کو عطیہ کی صلاحیت کا اندازہ ہوا تو مولانا نے عطیہ کو اپنے خیالات کے عین مطابق پایا۔

کیوں کہ عطیہ فیضی نہایت باذوق اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں، اردو، فارسی اور انگریزی پر ان کو ید طولیٰ حاصل تھا، وہ سوشیل اور کلچرل کاموں میں شوق سے شریک ہوتی تھیں۔ عطیہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہوچکی ہیں لیکن اردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے صرف مشق کی ضرورت ہے۔“ (بحوالہ خطوط شبلی، ص: ۳۱، بنام زہرا بیگم وعطیہ بیگم فیضی مرتبہ امین زبیری و یوسف قیصر شمسی، مشین پریس آگرہ)

اس خط سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں میں مولانا شبلی سروجنی نائیڈو کی طرح کسی مسلمان عورت کو دیکھنا چاہتے تھے اور اس خط کے ذریعہ عطیہ فیضی کی شخصیت تعمیر کررہے ہیں کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود ہے آپ بن سکتی ہیں۔ اسی فکر سے عطیہ اور مولانا شبلی کے درمیان رفاقت بڑھتی گئی اور مشن کو پورا کرنے کے لیے مولانا شبلی نے خطوط بھیجے تاکہ عورتوں میں تعلیم عام ہوجائے۔

ان خطوط کو لے کر ناقدین شبلی نے ان کے کردار کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے اور مولانا شبلی کے مداحوں نے ناقدین شبلی کا پوری قوت کے ساتھ تعاقب کیا اور مولانا کی ذات کو بے گناہ ثابت کیا ہے۔ ایک گروہ نے کم ظرفی کا مظاہرہ کیا اور

دوسرے گروہ نے بھی کچھ مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ بالغ و باشعور انسان کے لیے مطالعہ روح کی غذا ہے۔ مطالعہ سے جدید تدبر وتفکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ مطالعہ اگر شوق و رغبت سے کیا جائے تو وہ اس کو ماہر فن بنا دیتا ہے۔ مولانا شبلی کو بچپن ہی سے مطالعہ اور کتب بینی کا شوق تھا، جب وہ اعظم گڑھ میں تھے بلا ناغہ ایک کتب فروش کی مکان پر جاتے اور وہاں گھنٹوں اپنی علم کی پیاس کو بجھاتے، ان کے والد کو اس طرح سے کتابوں کا پڑھنا اچھا معلوم نہ ہوا تو انھوں نے مولانا کو اس طرح مطالعہ کرنے سے منع کر دیا تو مولانا نے دوسری راہ اختیار کی اور اس کتب فروش سے کتابیں لا کر اپنے گھر میں مطالعہ میں منہمک ہو جاتے، پڑھنے کے ہی دوران مولانا میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہو چکا تھا، شعرا کے دواوین دوران تعلیم ہی میں زیر مطالعہ رہے۔ مولانا جب تعلیم سے فارغ ہوئے اور کسب معاش کے لیے تگ و دو کر رہے تھے اور ملازمت کی ذمہ داریوں کو بہ حسن و خوبی انجام دے رہے تھے اس حالت میں بھی مولانا کے ساتھ دیوان حماسہ رہتا تھا ذرا سا موقعہ ملا حماسہ کا مطالعہ شروع ہو گیا، شعری ذوق اور ذوق مطالعہ حماسہ کے ساتھ جڑا ہوا ہے زندگی کے سفر میں۔

مولانا شبلی جب علی گڑھ پہنچے ملازمت کے لیے اور سرسید کے روبرو پیش ہوئے اور سرسید نے جوان کا انٹرویو لیا مولانا شبلی کے ذوق مطالعہ کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اس کی دلچسپ اور دل کو چھو لینے کی روداد محمد امین زبیری نے ''ذکر شبلی'' میں یوں بیان کی ہے:

''خود مولانا شبلی نے راقم سے بیان کیا تھا کہ جب وہ سرسید سے پہلے دن انٹرویو کے لیے ملنے آئے تو سرسید نے ان کو کتب خانے میں بٹھایا، شیشے دار الماریوں میں مجلد کتابیں تھیں اور قفل لگے ہوئے تھے۔ مولانا شبلی کہتے ہیں کہ میں الماریوں کے پاس کھڑا ہو کر کتابوں کے نام دیکھتا رہا، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اسی حالت میں گزر گیا تو سرسید نے کہلا بھیجا کہ کل آؤ، جب دوسرے دن گیا تو پھر کتب خانے میں بٹھایا گیا۔ مگر آج سب قفل کھلے ہوئے تھے، اب میں نے کتابیں نکال کر دیکھنا شروع کیں۔۔۔ جب کافی وقت گزر گیا تو پھر کل حاضری کا حکم ہوا اور دونوں دن کی طرح کتب خانے میں بیٹھا لیکن آج دو تین کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں، میں نے کل جو کتابیں دیکھی تھیں ان میں سے دو چار انتخاب کر کے پاس رکھ لیں اور مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔ جب کل کے مقابلے میں، بہت زیادہ وقت گزر گیا تو سرسید خود تشریف لائے اور فرمایا کہ مولوی شبلی انٹرویو ہو گیا جاؤ اور کام شروع کر دو۔'' (بحوالہ رسالہ فکر و نظر علی گڑھ، جنوری تا دسمبر ۱۹۸۵ء، دنا موران علی گڑھ نمبر، پہلا کاروان، ص: ۹۳ تا ۹۴، نیز ۱۰۴)

اس میں مولانا شبلی کی سوچ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کتابوں کے دیکھنے و مطالعہ کے کتنے شوقین تھے، سرسید کے کتب خانے نے تو ان کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا اور سرسید اس میں علم کے جوہری ہوتے ہوئے اور مولانا شبلی علم کے جوہر، دونوں سے ذوق کتب و مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا شبلی کے اس ذوق کو دیکھ کر سرسید نے مولانا کے لیے کتب خانے کے دروازے کھول دیتے اور قفل کی کنجی بھی حوالے کر دی مولانا نے غنیمت سمجھا اور خوب جم کر سرسید کے کتب خانہ سے استفادہ کیا اور اپنے اندر روشن خیالی اور وسیع النظری پیدا کر لی اب سوچ کا محور یکسر بدل گیا، علی گڑھ ہی کی بات ہے کہ مولانا کے ایک دوست تھے وہ کتابوں کے بہت شوقین تھے، وہ مولانا شبلی کے پاس کتابیں بہ طور تعلّی کے بھیجا کرتے تھے، مولانا ان کی قدر کرتے ہوئے اور اپنے علم کی تشنگی بجھانے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ ضرور کیا کرتے تھے۔

ہندوستان کا شاید ہی کوئی کتب خانہ ہو جس کو مولانا نے نہ دیکھا ہو، چاہے وہ رام پور کا سرکاری کتب خانہ، لکھنو میں مولوی حامد حسن صاحب کا کتب خانہ، خدا بخش لائبریری بانکی پور، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد وغیرہ شہر کے ذاتی کتب خانوں اور کتابوں کے نادر ذخیرے

کے پاس ضرور جاتے تھے۔ ایک مرتبہ بمبئی میں اپنے شاگرد مولوی عبدالسلام ندوی سے فرمایا کہ جامع مسجد کے مختصر سے کتب خانہ کو دیکھ آؤ اور وہاں کی نایاب قلمی کتابوں کے نام کی فہرست بنا کر لاؤ، وہ چند کتابوں کے نام لکھ لائے، انھیں کتابوں میں قفال کی کتاب محاسن الشریعہ کا نام بھی تھا، مولانا نے جب اس کو دیکھا تو خوشی خوشی کہنے لگے کہ یہی ایک کتاب دیکھنے کے قابل ہے اور دوسرے دن مولانا اس کتب خانے میں خود گئے اور اس کا مطالعہ کیا اور ذوق مطالعہ کا ثبوت دیا۔ (کتب خانہ چھوٹا ہو یا بڑا مولانا نے اپنی بساط کے مطابق اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔)

مولانا شبلی علی گڑھ کالج میں تعلیم و تعلم میں مشغول ہیں اور قدیم سوچ کو کچھ پیچھے کر کے جدید کی مفید باتوں کو قبول کیا اور سرسید اور ان کے کتب خانہ اور علی گڑھ کالج کے ماحول نے مولانا کی سوچ کی کایا پلٹ دی اور ان کے قلب میں تاریخی و تحقیقی روشنی داخل ہوگئی۔ تصنیفی ذوق ابھر آیا، مولانا کو الفاروق لکھنے کا خاکہ ذہن میں آیا مواد ہندوستان میں کم تھا۔ الفاروق کے لیے پُر جوش تھے اپنے ملک میں مواد کافی نہ تھا، اس لیے مولانا کو مصر و شام اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے مطالعے کی ضرورت تھی رخت سفر باندھ لیا اور مولانا کا اصلی مقصد اس سفر سے قدیم کتابوں کا مطالعہ تھا، سفرنامے میں خود فرماتے ہیں کہ اتنے طویل سفر کا مقصد یہاں کے کتب خانوں کو دیکھنا ہے۔ مطالعہ لوگوں سے مل کر بھی ہوتا ہے، یا مطالعہ کا پتہ ملتا ہے، مولانا شام کے سفر پر ہیں کشتی میں جا رہے ہیں، نصرتِ الٰہی ہوتی ہے کہ اسی کشتی میں شیخ عبدالفتاح جو دنیا کے چوٹی کے عالم تھے ان سے ملاقات ہوئی گویا کہ ندی سمندر میں جا کر ضم ہو جاتی ہے یہ ملاقات مولانا کی زندگی کے لیے تیز مطالعہ اور پڑھنے لکھنے اور سوچنے اور سیکھنے کے زاویہ سے بہت مفید ثابت ہوئی ان ہی کی معرفت سے شیخ علی ظبیان سے ملاقات ہوتی ہے جو علمی آدمی تھے ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہی ہوئی اور عرب و عجم کا ایک حسین امتزاج ہوتا ہے مولانا بیروت میں قیام پذیر ہیں وجہ یہ ہے کہ شیخ طاہر جزائری سے ملاقات کا اشتیاق تھا وہ اصلاً افریقی تھے مگر زیادہ دن مصر اور شام میں گزارتے تھے۔ یہ چلتا پھرتا کتب خانہ تھا، نادر کتابوں اور قلمی کتابوں کے نام ان کی نوک زبان پر تھے اور حافظہ کا یہ عالم تھا کہ ان کی یادداشت (کناشہ) میں ہر کتب خانہ کے نوادرات اور کتابوں کے نام درج تھے، مولانا نے ان سے ملاقات کی اور اپنے ذوق مطالعہ میں ایک باب کا انوکھا اضافہ کرلیا۔ مولانا بیت المقدس جب پہنچتے ہیں تو وہاں کے مفتی شہر سید طاہر اور دوسرے علماء فضلاء سے ملاقات کرتے ہیں اور علمی مسائل پر گفتگو کر کے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے خیالات سے استفادہ کرتے ہیں۔

قسطنطنیہ میں کتب خانے دور دور کے فاصلے پر تھے مولانا کئی میل کا سفر روزانہ کر کے ان کتب خانوں سے مستفید ہوتے اور بہت ہی ذوق و شوق کے ساتھ ان تکالیف کو برداشت کرتے جو ان کے راستے میں حائل تھیں، مولانا کو کتب خانے میں جو ان کے مقصد کی کتابیں ہوتیں بڑی دلجمعی کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتے اور مابقیہ پر سرسری نگاہ دوڑاتے تھے۔ مصر میں سب سے بڑا کتب خانہ خدیویہ تھا۔ جو اب کتب خانہ مصریہ کہلاتا ہے مولانا نے اس کے بارے میں یہ فرمایا کہ قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں سے بہتر ہے اور اس کو بڑی تفصیل اور عمیق نظروں سے مشاہدہ کیا۔ مولانا شبلی کو مطالعہ سے اتنی دلچسپی تھی کہ وہ صحت و علالت، سفر و حضر، جلوت و خلوت، غرض کہ ہر حالت میں کتابیں ان کے ساتھ رہتیں، مولانا نے فلسفہ، منطق، فقہ، تفسیر، حدیث، غرض تمام علوم کو پڑھا تھا تاریخ و ادب جو کہ ان کے جسم و روح کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں مولانا خود فرماتے ہیں کہ یہ تو ہمارے دسترخوان کی چٹنی ہے۔

مولانا شبلی کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کا مطالعہ ہر فن میں وسیع تھا۔

اہل بیت رسول ﷺ کی زندگی میں

(علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی آخری نظم)

افلاس سے تھا سیدہؓ پاک کا یہ حال — گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں — چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار — گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح وشام تھا
آخر گئیں جناب رسولؐ خدا کے پاس — یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذن عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کرسکیں نہ عرض — واپس گئیں کہ پاس حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضورؐ نے — کل کس لیے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منھ سے کہہ سکیں — حیدرؓ نے ان کے منھ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کے غریبان بے وطن — جن کا کہ صفہ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز — ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گزرتی ہیں — میں ان کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق — جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدہ پاکؓ رہ گئیں — جرأت نہ کرسکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دختر خیرالانامؐ تھا

Sheraz Ahmed: M.Com, ACA, CWA, L.L.B (IFRS)

& ASSOCIATES

CHARTERED ACCOUNTANTS & AUDITORS

(A Globol Harnessing Talent and Providing Quality Services

اے ایس اینڈ اسوسئیٹس

چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس اینڈ آڈیٹرس

Main Office: # 5-9-88/1/2/E, Saphire Complrex, Ground Floor. Fateh Maidan, Hyderabad **Consulting Office** Sri Sadan Kuthbiguda. Hyderabad. **Mob:** 9949073525-9704910966
Email: mail2hhassociates@gmail.com

SERVICES RENDERED BY CHARTERED ACCOUNTANTS

☆Accounting & Auditing
☆Arbitration, Conciliation & Family Settlement
☆Being Independent Directors on board of Componies- Implemention of corporate
☆Governance ☆Brand & Business Evaluation
☆FEM☆Financial Management System
☆HRD☆Information & Technology
☆Investigation & Detection
☆Information Planing☆Mergers & Acquistion
☆Project Reports☆Strategy & Planing
☆Tax Advisory and representation before various authorities and departments for :
☆Income Tax☆Profession Tax
☆GST☆FEMA☆Audit

احمد نور عینی
پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

علامہ شبلی اور مدارسِ اسلامیہ کا نصاب و نظامِ درس

زائد از ڈیڑھ صدی پہلے کی بات ہے، یعنی اس زمانے کی بات ہے جب ہندوستان جنت نشان کی سونا اگلتی دھرتی پر استعمار اپنے اقتدار کے پنجے بے رحمی کے ساتھ گاڑنے میں کامیاب ہو رہا تھا، ہندوستان کا دل شہرِ دلی مغلیہ عظمت وشوکت کی آخری دھڑکنیں گن رہا تھا، دلی کا مرکزِ اقتدار لال قلعہ انتقالِ اقتدار کا ماتم کر رہا تھا، گویا مغلیہ سلطنت کا وہ آفتاب جو اورنگ زیب کے بعد لب بام آ گیا تھا ہمیشہ کے لیے غروب ہوا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی زمانے میں اتر پردیش کے ایک مردم خیز خطہ اعظم گڈھ میں ایک ایسا آفتاب طلوع ہوتا ہے جو آگے چل کر علم کدوں میں تحقیق کی کرنیں بکھیرتا ہے، مخالفت کی ہوائیں ہر چند اس کی ضیا گستری کو بدلیوں کی اوٹ میں چھپانا چاہتی ہیں مگر اس کی کرنیں بدلیوں کا سینہ چیر کر نیچے اترتی جاتی ہیں۔ جس زمانے کی یہ بات ہے وہ ۱۸۵۷ء کا سال ہے اور اعظم گڈھ کے جس آفتاب کا تذکرہ ہے اسے دنیا شبلی نعمانی کے نام سے جانتی ہے۔

علامہ شبلیؒ قافلۂ سخت جاں کے وہ سالار تھے جن کی صحرا نوردی کو ریگستانی ہواؤں کے جھکڑ بھی نہ روک سکے، اور جن کی آبلہ پائی کے نقوش آج بھی کاروانِ علم وتحقیق کو منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ علامہ شبلیؒ کی شخصیت بیسویں صدی میں تعلیمی انقلاب کا عنوان ہے، مردم سازی ومصنف گری کا نام ہے، تخلیق وتحقیق سے عبارت ہے۔ علامہ شبلیؒ گوناگوں خصوصیات کے حامل اور مختلف صلاحیتوں کے مالک تھے، میدان ادب کے شہسوار بھی تھے اور اقلیم علومِ اسلامیہ کے تاجدار بھی، تاریخ کے بحر متلاطم کے غوطہ خوار بھی تھے اور سیرت نگاری کے انوکھے اسلوب میں یکتائے روزگار بھی، انگریزی کی ترویج کے لیے طبقۂ قدیم سے برسرپیکار بھی تھے اور قدیم صالح وجدید نافع کو جمع کرنے کے علم بردار بھی۔

دامنِ اسلام سے شبہات کے داغ دور کرنا ان کی فکر تھی، آریہ سماجیوں کے بڑھتے قدم کو روکنا ان کا دردِ دل تھا، تاریخ کو مستشرقین ومعاندین کی زہر آلود تحریفات سے پاک کرنا ان کا مشن تھا، علم کلام کی تدوینِ نو ان کا عزم تھا، تعلیمی انقلاب اور اصلاح نصاب ان کی فکری وعملی مساعی کا محور تھا۔

علامہ شبلی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا یہاں جائزہ لینا نہ ممکن ہے اور نہ مقصود، یہاں ان کی شخصیت کے صرف اس پہلو کا جائزہ لیا جائے گا جس کا تعلق نصابِ درس میں اصلاح واضافہ سے ہے۔

علامہ شبلی کے دور میں جو نصاب رائج تھا اس کے بارے میں ان کا یہ احساس تھا کہ یہ نصاب اپنی موجودہ صورت میں قوم ومذہب کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی ہے، برطانوی استعمار کی وجہ سے انگریزی کا ہر طرف غلبہ ہو چکا تھا، استشراق کی وجہ سے اسلام کا قلعہ چوطرفہ حملوں کی زد میں تھا، سائنس کی ترقی مذہب کی فرسودگی کا تصور عام کر رہی تھی، مستشرقین کی طرف سے مسلمانوں کی تاریخ میں ملایا جانے والا زہر نسل نو کی فکری زوال کی غمازی کر رہا تھا، ڈارون کا نظریۂ ارتقا، میکڈوگل کا نظریۂ جبلت، فرائڈ کا نظریۂ جنسیت، وولٹائر کا نظریۂ فطری مذہب، روسیو کا نظریۂ آزادیِ فرد، کارل مارکس کا

نظریہ ملکیت اور دیگر الحاد گزیدہ مفکرین کے نظریات نے اسلام کے نظامہائے حیات کی مستحکم عمارت کو متزلزل کرنے کی کوششیں شروع کردی تھیں، سیکولرزم اقتدار کے ایوانوں میں اپنا جھنڈا لہرا رہا تھا، کیپٹلزم تجارت کی منڈیوں کو اپنے شکنجے میں کس رہا تھا، کمیونزم کی زمین ہموار ہورہی تھی، کارپوریٹ سیکٹر بے حیائی کا کلچر عام کرنے کے لیے بال و پر پھیلا رہا تھا ایسے حالات میں قدیم نصاب جدید دور کے چیلنجس قبول کرنے سے قاصر تھا۔

علامہ شبلی کی فکرِ رسا اور نگاہِ دوررس نے اس کا ادراک کرلیا تھا، اس لیے وہ نصاب میں اصلاح و اضافہ کے لیے مستقل آواز اٹھاتے رہے، لوگوں کو جگاتے رہے، یورپ سے در آنے والے خطرات سے واقف کراتے رہے، عباسی دور میں آنے والے یونانی خطرات کی مثال دے کر سمجھاتے رہے، تقریر ہو یا تحریر، نجی مجلس ہو یا اجلاس عام، سفر ہو یا حضر، مصر و شام ہو یا ممبئی وحیدرآباد، علی گڈھ کی پروفیسری ہو یا حیدرآباد کی ملازمت، ندوہ کی معتمدی ہو یا اعظم گڈھ کا قیام ہر جگہ ان کا دلِ دردمند رائج نصاب پر کڑھتا تھا، اور ان کی فکرِ ارجمند نصاب کو جدید قالب میں ڈھالنے کے لیے ستاروں پر کمندیں ڈالتی تھی۔

فیضِ عام کانپور میں جب اصلاحِ نصاب کی آواز اٹھی تو یہ آواز دراصل شبلیؒ کی صدائے بازگشت تھی جو انھوں نے اپنے سفر روم و مصر و شام کے وقت لگائی تھی اور جو مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم میں دبے سروں میں موجود تھی، علامہ شبلیؒ نے اس آواز کو فیضِ عام کے اجلاس کے بعد اس زور و شور سے اٹھایا کہ پورا ہندوستان گونج اٹھا، اور اصلاح نصاب کے لیے جب 'ندوہ' نامی کمیٹی بنی تو شبلیؒ سب سے سرگرم کارکن کے طور پر سامنے آئے، تحریک ندوہ کی سرگرمیوں پر اگر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو نظر آئے گا کہ علامہ شبلی کبھی تحریک پیش کررہے ہیں، کبھی تجویز سامنے رکھ رہے ہیں، کبھی پیش کی ہوئی تجویز کی تائید میں پر مغز تقریر کررہے ہیں، کبھی اجلاس کی صدارت فرمارہے ہیں اور کبھی جیب خاص سے ندوہ کے لیے چندہ فراہم کررہے ہیں، غرضے کہ علامہ شبلیؒ دامے درمے سخنے ہر اعتبار سے اصلاح نصاب کی اس کمیٹی کا ساتھ دیتے ہیں، حتی کہ علی گڈھ کی مدرسی چھوڑتے ہیں اور حیدرآباد کی ملازمت قربان کرکے ندوہ کے آستانے پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔

اصلاح نصاب کے تعلق سے علامہ شبلیؒ کا جو موقف تھا اسے انھوں نے پوری بصیرت اور مکمل شرحِ صدر کے ساتھ، نیز پوری ایمانداری اور سچے دل کے ساتھ اختیار کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ مبغوض بھی ہوئے، مطعون بھی ہوئے، مشکوک بھی ہوئے اور کوئے یار سے نکلنے پر مجبور بھی ہوئے؛ مگر ان سب کے باوجود انھوں نے اپنے موقف سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ علامہ شبلی اپنے زمانے کے مروج نصاب کو ناکافی ضرور سمجھتے تھے؛ مگر۔ حاشا وکلا۔ ناکارہ ہرگز نہیں سمجھتے تھے؛ چناں چہ وہ خود لکھتے ہیں:

''مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے، مثلاً دیہات کے جاہل مسلمانوں میں احکام اسلام کا پھیلانا اتنا بڑا وسیع کام ہے جس کے لئے سینکڑوں ہزاروں مولویوں اور واعظوں کی ضرورت ہے، اسی طرح مساجد کی امامت اور فتوی وغیرہ بہت سے کام ہیں جو محض خالص قدیم یافتہ حضرات انجام دے سکتے ہیں، اس لیے تقسیم عمل کی رو سے یہ کام اس گروہ کے ہاتھ میں دے دینے چاہئیں، اور طرح پر ان کی تائید و اعانت اور احترام کرنا چاہیے۔ اس نقطۂ خیال کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو جو لوگ قدیم عربی مدارس کو بے کار بتاتے ہیں وہ بھی تسلیم کرلیں گے کہ دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں ہے''۔ (مقالات شبلی: ۳/۱۴۳)

علامہ شبلی کے ذہن میں نصاب کا جو خاکہ تھا اور جس کو عملاً تطبیق دینے کے لیے وہ تاحیات کوشش کرتے رہے اسے ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں: رائج نصاب میں اضافہ اور رائج نصاب میں اصلاح۔

۱۔ رائج نصاب میں اضافہ:

رائج نصاب میں اضافہ سے مراد ایسے موضوعات اور ایسے علوم وفنون ہیں جو علامہ شبلی کے دور میں داخل نصاب نہیں تھے؛ لیکن انھوں اپنی دور بینی سے ان کی اہمیت کا ادراک کرلیا تھا، اس لیے وہ انھیں داخلِ نصاب کرنے کے لیے کوشاں رہے۔

وہ موضوعات یا وہ علوم وفنون حسب ذیل ہیں:

☆ انگریزی زبان:

علامہ شبلی ۱۸۸۳ء میں علی گڈھ میں تدریسی شعبے سے منسلک ہوئے، یہاں آکر انھوں نے انگریزی داں طبقے کو قریب سے دیکھا، وہ اس طبقے سے مرعوب تو نہ ہوئے؛ بل کہ خود ان کے بقول ''انگریزی فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، ....بس خالی کوٹ اور پتلون کی پیائش گاہ ہے''۔ (حیات شبلی: ۱۳۱)؛ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انھیں یہاں آکر انگریزی زبان کی اہمیت وافادیت کا احساس ہوا اور انگریزی زبان سیکھنے پر انھوں نے زور دیا، ان کی نگاہ دور رس نے اس بات کو تاڑ لیا تھا کہ اگر مدارس کے فضلا انگریزی سے واقف ہوں گے تو مغرب کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کو بخوبی سمجھ سکیں گے اور جدید اسلوب میں اس کا تشفی بخش جواب دے سکیں گے؛ اسی لیے جب ندوہ کی تحریک اٹھی تو شبلی شروع ہی سے انگریزی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے داخل نصاب کرنے بضد تھے۔

علامہ شبلی نے جس زمانے اور جس ماحول میں انگریزی زبان کو داخل نصاب کرنے کی بات کہی اس زمانے اور ماحول میں انگریزی زبان کی تعلیم کا مطالبہ کرنا اپنے آپ کو لعنت وملامت کا ہدف بنانا تھا؛ چناں چہ ندوہ کے ایک اجلاس میں جو ۱۸۹۹ء میں منعقد ہوا تھا علامہ شبلی نے انگریزی زبان کو ندوہ کے نصاب میں داخل کرنے کی تحریک کی تو مولانا حبیب الرحمان شیروانیؒ جیسے وسیع الفکر عالم نے اس تحریک سے اعراض کیا، نتیجۃً اس پر بحث نہ ہوسکی، اجلاس کے ختم پر علامہ شبلی نے خفگی کا اظہار کیا تو مولانا شیروانی نے کہا کہ تمہاری بدنامی کا ڈر تھا۔

اصلاحِ نصاب کے لیے اٹھنے والی تحریکِ ندوہ کی میٹنگ کا جب یہ حال تھا کہ اس میں انگریزی کی بات زبان پر لانا بدنامی کو دعوت دینا تھا تو ذرا سوچیے کہ دوسرے اداروں کا کیا حال رہا ہوگا؛ لیکن شبلیؒ بھی اڑے رہے اور راہِ اصلاح میں حائل سنگ گراں کو اپنے پائے استقامت سے دو نیم کرتے رہے، اور بالآخر اپنی معتمدی کے دور میں ۱۹۰۵ء میں وہ انگریزی کی تعلیم باضابطہ جاری کرنے میں کامیاب ہوگئے، اربابِ ندوہ کے بارے میں خود شبلیؒ کا یہ تاثر ہے کہ ''انگریزی کے نام سے ان لوگوں کی روح نکل جاتی ہے''۔ (مکاتیب شبلی: ۱/۱۲۱)

جس زمانے میں انگریزی کے نام سے ہی لوگوں کی روح نکل جاتی تھی اور اختیاری مضمون کی حیثیت سے بھی اس کی تعلیم الحاد کی تخم ریزی تصور کی جاتی تھی، اس زمانے میں شبلی نے نہ صرف یہ کہ انگریزی زبان کو بہ حیثیت لازمی مضمون کے داخلِ درس کیا؛ بل کہ انگریزی میں مہارت پیدا کرنے کے لیے مستقل دو سال کا کورس شروع کرنے کی تجویز پیش کی، (حیات شبلی: ۳۳۶)۔ انگریزی کے لیے دو سال کے خصوصی کورس کا جو خواب شبلی نے دیکھا تھا اسے شرمندۂ تعبیر ہونے میں ایک صدی کا وقت لگا، گویا بیسویں صدی کے شروع میں شبلی جس بلند مقام پر کھڑے تھے وہاں تک پہنچنے میں اہل علم کے کارواں کو ایک صدی لگی۔

شبلی نہ صرف یہ کہ فضلا کے اندر انگریزی کی لیاقت پیدا کرنا چاہتے تھے؛ بل کہ علوم اسلامیہ اور خاص کر فقہ اسلامی کو انگریزی میں منتقل کرنا چاہتے تھے؛ مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

''مجھے مولانا کی اس رائے سے کہ دار العلوم کے تمام طلبہ کے لیے انگریزی لازمی کی جائے اتفاق نہ تھا، چناں چہ ایک دن موقع پاکر میں نے عرض کی کہ آپ مدرسے میں انگریزی کو لازمی کیوں قرار دیتے ہیں، انھوں نے ایک آہ سرد کھینچی اور فرمایا: دیکھ رہے ہو کہ نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلی مسلمان خاندانوں سے مٹتی

جاتی ہے، اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزوں کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا، اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی، اب بھی دیکھو، جب غیر مذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک سمجھنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ اپنی اس پیاس کو سیل کے انگریزی ترجمے سے بجھاتے ہیں، فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمے پر رہ گیا ہے، کیا یہ کام ہمارے علما کا نہیں ہے؟"۔(حیات شبلی:۱۴۰)

☆علوم جدیدہ:

یہ سچ ہے کہ یورپ کی شبِ دیجور کو اندلس کی دانش گاہوں نے سپیدۂ سحر سے آشنا کیا، اور علوم وفنون اندلس کے مسلمانوں سے یورپ کے عیسائیوں تک پہنچے؛ مگر یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے ان علوم وفنون میں کافی توسیع کی اور اس میں غیر معمولی اضافہ کیا، علوم کی یہ ترقی وتوسیع اور یہ تطور واضافہ اس دور میں ہوا جب کہ کلیسا شکست کھا چکا، اور مذہب فرد تک محدود کردیا گیا ، اسی بنا پر ان علوم وفنون میں بہت سے ایسے تصورات ونظریات اور کئی ایسے مفروضات ومستنتجات آئے جو نہ صرف اسلام کے خلاف ہیں؛ بل کہ مذہب کے بھی خلاف ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام پر کیے جانے والے کئی اعتراضات ایسے ہیں جن کا مستدل علوم جدیدہ کے تصورات ونظریات ہیں اور جن کی پشت پر وہ افکار ہیں جو علوم جدیدہ سے ماخوذ ہیں، ان علوم کے پڑھنے کی وجہ سے نہ صرف غیر مسلم کا ذہن مذہب مخالف ہوتا ہے؛ بل کہ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن میں بھی شکوک وشبہات جنم لیتے ہیں، اسی وجہ مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے طبقے کا ان علوم جدیدہ سے واقف ہونا ضروری ہے؛ تاکہ وہ اسلام مخالف نظریات کو سمجھ سکیں، اسلام مخالف اعتراضات کا جدید اسلوب میں جواب دے سکیں اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں سے شکوک وشبہات دور کرسکیں۔

علامہ شبلیؒ کے معاصر علما کو یہ خوف تھا (اور ان کا خوف بیجا بھی نہ تھا) کہ علوم جدیدہ سے چوں کہ مذہبی عقائد متزلزل ہوسکتے ہیں اس لیے ان کی تعلیم نہیں دی جانی چاہیے، علامہ شبلیؒ کو بھی یہ خوف تھا کہ علوم جدیدہ سے مذہبی عقائد پر زد پڑے گی؛ لیکن وہ اس کو ایک دوسرے انداز سے سوچتے تھے، ان کا یہ کہنا تھا کہ جس طرح دور عباسی کے علمانے اور خاص کر امام غزالیؒ نے یونانی فلسفہ کو مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کی تھی اور ان کی اس کوشش کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی عقائد سلامت رہے، اسی طرح موجودہ دور کے راسخ العقیدہ حاملانِ علوم نبوت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ علوم جدیدہ کو مشرف بہ اسلام بنانے کی کوشش کریں؛ تاکہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے عقائد میں خلل پیدا نہ ہو؛ چناں چہ وہ دارالعلوم ندوہ کی تقریب سنگ بنیاد میں تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"علما کو اس بات کا خوف مطلق نہیں کرنا چاہیے کہ علومِ جدیدہ مذہبِ اسلام کے برخلاف ہیں اور ان کی تعلیم سے عقائدِ مذہبی میں خلل آجاتا ہے؛ کیوں کہ جب امام غزالیؒ کی طرح وہ ان علوم کو خود حاصل کریں گے تو ان کو وہ مسائل معلوم ہوجائیں گے، جن میں مذہبی مخالفت کا احتمال پیدا ہوسکتا ہے، اس صورت میں وہ ان مسائل کی تردید یا اسلام سے ان کی مطابقت بخوبی کرسکیں گے اور جدید تعلیم یافتوں کو مذہبی شکوک وشبہات سے محفوظ رکھ سکیں گے، صاف ظاہر ہے کہ جب تک ہماری قوم کے علما جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذات خود حاصل نہ کریں ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں، جو یورپ کے ملاحدہ مذہب اسلام پر کرتے ہیں اور جن کا اثر ہماری قوم کے تعلیم یافتوں پر پڑتا ہے، علوم جدیدہ کے سامنے قدیم فلسفہ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے توپ کے سامنے غلیل کی مثال ہے"۔ (خطبات شبلی:۹۰)

علامی شبلی کا یہ عزم تو تھا؛ مگر علوم جدیدہ کی تعلیم دو بڑی مشکلات سے دوچار تھی، ایک یہ کہ علوم جدیدہ کی معیاری کتابیں انگریزی زبان میں تھیں؛ اور چوں کہ طلبہ کا انگریزی زبان کی کتابوں کو سمجھنا بہت دشوار تھا اس لیے یہ کتابیں داخل نصاب

نہیں کی جاسکتی تھیں؛ اسی لیے ضروری تھا کہ ان علوم کی عربی کتابیں داخل نصاب کی جائیں، اور دوسری مشکل یہ تھی کہ اگر یہ علوم عربی کتابوں کے ذریعہ بھی پڑھائے جاتے تو بھی ان کتابوں کی تدریس ایک مستقل مسئلہ رہتی؛ کیوں عربی داں علما ان علوم سے ناواقف تھے (الا ماشاء اللہ) اور اگر جدید تعلیم یافتہ حضرات کا سہارا لیا جاتا تو وہ عربی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے تدریس کا فریضہ انجام دینے سے قاصر رہتے۔ علامہ شبلیؒ کے الفاظ میں:

''علوم جدیدہ کی بعض کتابیں جو عربی میں ترجمہ ہوگئی ہیں، نصاب میں شامل کی گئیں؛ لیکن اس موقع پر یہ ظاہر کردینا ضرور ہے کہ ان کے پڑھانے کا انتظام مشکل ہے، ہمارے علما ان کتابوں کو پڑھا نہیں سکتے، اور انگریزی خواں عربی سے آشنا نہیں''۔ (مقالات: ۱۵۹/۳)

علامہ شبلیؒ مشکلات سے ڈر کر پیچھے ہٹنے والے لوگوں میں نہیں تھے، انھوں نے جدید طبعیات میں بیروت سے چھپنے والی 'الدروس الاولیۃ' اور جدید ہیئت میں قسطنطنیہ سے طبع ہونے والے فارسی رسالہ 'ہیئت جدیدۃ' کو داخل نصاب کیا، اور مولانا حمید الدین فراہی کو 'الدروس الاولیۃ' پڑھانے کے لیے باصرار ندوہ بلایا اور 'ہیئت جدیدۃ' کی تدریس کا اعزاز پروفیسر مرزا ہادی رسوا کے حصے میں آیا؛ مگر افسوس کہ علوم جدیدہ کی تعلیم کا یہ انقلابی کام انقلابی طرز پر آگے نہ بڑھ سکا۔

☆ جدید علم کلام:

تیرھویں صدی عیسوی میں جب صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہوتا ہے تو یورپ کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو تلوار کے زور پر زیر نہیں کیا جاسکتا، اس لیے اب عسکری جنگ کے بجائے فکری جنگ چھیڑی جائے؛ چناں چہ اس کے لیے انھوں اسلام کا باضابطہ مطالعہ شروع کیا جو آگے چل کر استشراق کے نام سے معروف ہوا، یورپی اہلِ علم عربی زبان سیکھ کر اسلام کے مصادر اصلیہ کا مطالعہ کرنے لگے اور علم و تحقیق کی بنیاد پر اسلام پر اعتراضات کرنے لگے، اور اسلام کے تئیں لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کے بیج بونے لگے، پھر جب اٹھارہویں وانیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں الحادی نظریات اور لادینی نظامہائے حیات کو فروغ حاصل ہوا تو اسلام کے صاف ستھرے نظریات اور اسلام کے خدائی نظامہائے حیات ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے، سارے مذاہب نے ان کے آگے ہتھیار ڈال دیے؛ لیکن اسلام وہ اکیلا مذہب تھا اور ہے جو ان کے لئے چیلنج بنا رہا، اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے انھوں نے علمی وسائنسی بنیادوں پر اسلامی تعلیمات اور اسلام کے پاکیزہ نظامہائے حیات کو نشانہ بنانا شروع کردیا۔

ظاہری بات ہے کہ صلیبی جنگوں کے بعد کے زمانے میں اٹھائے گئے اور خاص کر اخیر کی صدیوں میں الحادی نظریات ولادینی نظامہائے حیات کی وجہ سے اسلام پر کیے گئے اعتراضات وشبہات کو دور کرنے کے لیے عباسی دور کا علم کلام (جس نے اپنے زمانے میں ڈگمگاتے قدم سنبھالے) ناکافی ہوگیا، ایک تو اس وجہ سے کہ اعتراضات وشبہات جدید فلسفہ وسائنس کی بنیاد پر کیے جانے لگے، دوسرے یہ کہ اعتراضات وشبہات اب عقائد تک محدود نہیں رہے؛ بل کہ ان کا دائرہ کافی وسیع ہوگیا، تیسرے یہ کہ فریقین کے مسلمات بدل گئے، مثلا: پہلے وجود باری فریقین کے نزدیک مسلم تھا اس لیے رویت باری کی بحث پر اکتفا کیا گیا؛ لیکن اب رویت باری کی بحث ثانوی درجہ کی ہوگئی، اولا وجود باری کو ثابت کرنا ضروری ہوگیا۔ علامہ شبلیؒ نے قدیم علم کلام کے ناکافی ہونے کا ادراک کرلیا تھا اس لیے انھوں نے جدید علمِ کلام مدون کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی؛ چناں چہ ۱۸۹۴ء میں ندوہ کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قدیم علم کلام جو فلسفۂ یونانی کے مقابلہ میں ایجاد اور مدون ہوا تھا آج تک بغیر کسی اضافہ وترمیم کے درس میں داخل ہے، حالاں کہ یہ ظاہر ہے کہ جو اعتراضات حال کی تحقیق سے

پیدا ہوتے ہیں ان کے لیے وہ علم کلام کیوں کر کافی ہوسکتا ہے جو اس وقت ایجاد ہوا تھا جب کہ یہ اعتراضات پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، مثلاً: یونانی آسمان کے وجود کے معترف تھے، صرف خرق والتیام سے ان کو انکار تھا، مسلمانوں کو نزول ملائکہ اور امکان معراج کے لیے خرق والتیام کے امکان کے ثبوت کی ضرورت تھی؛ چناں چہ علم کلام میں یہ امکان ثابت کر دیا گیا؛ لیکن آج یورپ والوں کو سرے سے آسمان کے وجود سے انکار ہے، اس لیے اب ہم کو آسمان کا وجود ثابت کرنا ضرور ہے''۔ (خطباتِ شبلی:۴۷)

جدید علم کلام کی تدوین کے سلسلے میں شبلی کے پیش نظر جو اصولی باتیں تھیں ان میں دو باتیں یہاں ذکر کر دینا مناسب ہے: ایک تو یہ کہ جدید علم کلام میں صرف عقائد سے بحث نہیں ہوگی؛ بل کہ اس میں وہ تمام مسائل آئیں گے جن میں دور حاضر میں اعتراض کیا جاتا ہے، خواہ ان کا تعلق عقائد سے ہو یا قانون واخلاق سے یا تاریخ وتمدن سے، دوسرے یہ کہ سمجھانے کا انداز اور دلائل پیش کرنے کا اسلوب سادہ اور واضح ہو؛ چناں چہ اپنی کتاب 'الکلام' میں رقم طراز ہیں:

''قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی؛ کیوں کہ اس زمانہ میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراضات کیے تھے عقائد ہی کے متعلق تھے؛ لیکن آج کل تاریخی، اخلاقی، تمدنی ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے، یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابل اعتراض نہیں جس قدر اس کے قانونی اور اخلاقی مسائل ہیں، ان کے نزدیک تعدد نکاح، طلاق، غلامی، جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا اس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ سب سے بڑی ضروری چیز یہ ہے کہ دلائل اور براہین ایسے صاف اور سادہ پیرایہ میں بیان کیے جائیں کہ سریع الفہم ہونے کے ساتھ دل میں اتر جائیں، قدیم طریقہ میں پیچ در پیچ مقدمات، منطقی اصطلاحات اور نہایت دقیق خیالات سے کام لیا جاتا تھا''۔ (الکلام:۲۵،۲۶)

علم کلام کو جدید قالب میں ڈھالنے کا احساس شبلیؒ کو اس قدر تھا کہ انھوں نے خود یہ کام شروع بھی کر دیا؛ الغزالی، الکلام اور علم الکلام اسی سلسلے کی ابتدا تھی؛ لیکن خود شبلی کا بیان ہے کہ وہ اس کام کو پورا نہ کر سکے، شبلی نے جدید علم کلام کے عظیم کام کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس میں بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ دو طرح کا نقص پایا جاتا ہے، ایک: جدید علوم ومسائل سے شبلی کی ثانوی درجہ کی واقفیت، دوسرے: اسلام کے صحیح عقائد کے لیے کتاب وسنت سے مراجعت کے بجائے متکلمین وحکمائے اسلام کی کتابوں سے مراجعت۔ (دیکھیے: حیاتِ شبلی:۱۴)

☆ تاریخ:

کسی بھی قوم کے لیے تاریخ کی وہی حیثیت ہے جو کسی بھی فرد کے لیے حافظے کی، تاریخ پوری قوم کا حافظہ ہوا کرتی ہے، اگر کوئی شخص صبح اس حال میں سو کر اٹھے کہ سونے سے پہلے تک کی ساری باتیں اس کے دماغ سے محو ہو جائیں تو اسے کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا کہ وہ کیا کرے، اسے بتانا پڑے گا کہ تمھیں ناشتہ کرنا ہے، تمھیں آفس جانا ہے وغیرہ، وہ خود سے کوئی فیصلہ نہیں لے پائے گا، بالکل یہی حال قوموں کا ہے، جب کوئی قوم اپنی تاریخ بھول جاتی ہے تو مستقبل کی صحیح منصوبہ بندی کرنے سے عاجز رہتی ہے، اس لیے تاریخ کا مطالعہ تو یوں بھی ضروری ہے، اور اگر تاریخ میں زہر ملایا جا رہا ہو، مسلمانوں کو اپنے اسلاف سے متنفر کیا جا رہا ہو، نسل نو کو عہد گزشتہ کی خوفناک تصویر دکھا کر ماضی سے کاٹا جا رہا ہو اور ان کا مستقبل تاریک کیا جا رہا ہو، ماضی سے بیزار کر کے حال کو تاریخ ساز کارناموں سے ناآشنا کیا جا رہا ہو تو پھر تاریخ کا مطالعہ اور زہر آلود تاریخ کا مقابلہ اشد درجہ ضروری ہو جاتا ہے، علامہ شبلی نے اس بات کا ادراک کر لیا کہ اعدائے اسلام نے لوگوں کو اسلام سے دور کرنے اور اسلام کی شبیہ خراب کرنے کے لیے تاریخ کو ہتھیار کے طور پر اپنایا ہے، چناں چہ یہ لوگ سیرت وتاریخ کو اس طرح

مرتب کررہے ہیں کہ پڑھنے والا غیر شعوری طور پر اسلام سے متنفر ہوجائے، پیغمبر اسلام کا تقدس اس کے دل سے نکل جائے، اور وہ اپنے ماضی سے بیزار ہوجائے، نتیجۃً وہ اسلام کے لیے حال کو لگانے اور مستقبل کو سنوارنے کی کوشش نہ کرے، اسی وجہ سی شبلیؒ تاریخ کے مطالعہ ومقابلہ کو ایک اہم مذہبی ضرورت شمار کرتے تھے؛ چناں چہ ندوہ کے جلسۂ دستار بندی (منعقدہ: ۱۹۰۷) سے خطاب کرتے ہوئے اس ضرورت کا اظہار کیا تھا (دیکھیے: خطبات شبلی: ۶۱)۔ اور ندوہ کے اجلاس (منعقدہ: ۱۹۱۲) میں علماء کرام کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا:

''......وہ سر ولیم مور صاحب کی لائف آف محمد پڑھتا ہے، اب اس کتاب کے اندر اندر جو زہر مخفی ہے، جو سم قاتل سرایت کر رہا ہے، اس کے پڑھنے والے کو خبر نہیں ہوتی اور زہر اندر اندر دوڑ جاتا ہے، اس کا کیا علاج ہے؟ آیا ہمارے علما اس کو پڑھتے ہیں؟ اور اس سے واقف ہیں یا نہیں؟ اگر واقف ہیں تو کسی سے انھوں نے فرمائش کی ہے کہ خیر تم ترجمہ ہی کر کے دو ہم اس کا جواب لکھیں گے، ایک عظیم الشان لٹریچر جو دوسری زبانوں میں پیدا ہوگیا ہے اسلام کو تباہ کرنے والا، برباد کرنے والا، آپ اسے اچھی طرح مٹا سکتے ہیں۔ یعنی (خلاصہ یہ کہ) تاریخ اسلام کا ہم نے کیا مقابلہ کیا ہے؟'' (خطبات شبلی: ۱۴۰)

علامہ شبلیؒ کی یہ تقریریں محض خطابت کا جوہر دکھانے کے لیے نہیں تھیں؛ بل کہ عملاً بھی انھوں نے تاریخ (جس میں سیرت بھی آجاتی ہے) کو اپنی دلچسپیوں کا میدان بنایا، تاریخ میں داخل کیے جانے والے زہر کو نکالنے اور تریاق فراہم کرنے کی کوششیں کیں، ان کے مضمون 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' کو اس سلسلہ کی سنہری کڑی قرار دیا جاسکتا ہے، علامہ شبلی نے اپنے اس تحقیقی مضمون میں مسلمانوں کے روشن ماضی کی جو خوب صورت تصویر کھینچی ہے اسے پڑھ کر دل بے ساختہ کہتا ہے:

ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

اسکندریہ کے کتب خانے کے بارے میں شبلیؒ نے تاریخ اسلام کے دامن سے ایک بڑے داغ کو صاف کیا، 'اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر' لکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا، جرجی زیدان کی 'تاریخ التمدن الاسلامی' کا آپریشن کرکے عرب کو اس فتنہ کی سنگینی سے آگاہ کیا، سیرت کے موضوع پر لکھی جانے والی مارگیولیوس اور سر ولیم وغیرہ کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کرائے؛ تاکہ سیرت النبی لکھتے ہوئے مستشرقین ومعاندین کے اعتراضات کی قلعی کھولی جاسکے۔

علامہ شبلیؒ نے جہاں اپنے قلم سے تاریخ کا مقابلہ کیا وہیں ندوہ میں 'صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی' کے نام سے ۱۹۱۰ء میں ایک شعبہ بھی قائم کیا، جس کا سکریٹری مولانا سید سلیمان ندویؒ کو بنایا، سید صاحب نے بہت محنت اور لگن سے کام کیا اور بہت سی تاریخی اغلاط کو جمع کرکے ایک رپورٹ تیار کی جو انھوں نے ندوہ کے سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سنائی؛ لیکن افسوس کے تاریخ کا یہ شعبہ بہت جلد تاریخ کا حصہ بن گیا، اور شبلی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوتے پھر خواب کی شکل اختیار کرگیا؛ البتہ شبلیؒ کے دار المصنفین نے تاریخ کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں تاریخ انھیں ضرور یاد رکھے گی۔

☆ ہندی وسنسکرت:

آریہ سماجیوں کی شدھی تحریک کی وجہ سے جب ارتداد کی آگ تیزی سے پھیلنے لگی اور گاؤں دیہات سے ارتداد کی خبریں آنے لگیں تو علامہ شبلی تڑپ اٹھے، اور شدتِ رنج میں یہ جملے ان کی زبان پر جاری ہوئے کہ ''اے بے حیاؤ! اور اے کم بختو! ڈوب مرو! یہ واقعات پیش آئے ہیں، ندوہ کو آگ لگادو اور علی گڈھ کو بھی پھونک دو!'' (دیکھیے: خطبات شبلی: ۱۱۸)۔ آریوں کے اس ارتدادی فتنے سے نمٹنے کے لیے علامہ شبلیؒ نے ندوہ میں ہندی اور سنسکرت کا ایک درجہ قائم کیا؛ تاکہ طلبہ ان زبانوں میں مہارت حاصل کرکے آریوں سے علمی وتحقیقی سطح پر

مقابلہ کرسکیں، اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کا انھیں جواب دے سکیں اور انھیں کی کتابوں سے ان کے موقف کو کمزور کرسکیں۔

آریہ سماجی مبلغین کا زور توڑنے کے لیے علامہ شبلیؒ نے اشاعتِ اسلام کے نام سے ایک مجلس قائم کی اور خدام الدین نام سے طلبہ کی جماعت تیار کرنی شروع کی، آریوں نے اپنے مذہب کے فروغ اور سناتن دھرم کی تبلیغ کے لیے 'گروکل' کے نام سے تربیت گاہیں قائم کر رکھی تھیں، گروکل کی سادگی، وہاں تربیت پانے والوں کی قناعت و ریاضت اور گروکل کے ارباب بست وکشاد کی تنظیم و منصوبہ بندی دیکھ کر شبلیؒ کے دل میں بارہا اس خیال نے انگڑائیاں لیں کہ مسلمانوں کے لیے بھی اس طرح کی کوئی تربیت گاہ ہونی چاہیے، جس میں تربیت پاکر مسلمان نوجوان آریوں سے مقابلہ کرسکیں اور فکری میدان میں انھیں شکست دے سکیں، اخیر عمر میں علامہ شبلیؒ جب کوئے یار چھوڑ کر اپنے دیار آگئے تو انھوں نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ کو اس مقصد کے لیے ایک مرکزی ادارہ بنانا چاہا؛ مگر عمر وفا نہ کرسکی۔

علامہ شبلی کے دل میں گروکل کی طرز پر اسلامی تربیت گاہ قائم کرنے کا ارادہ اس وقت کے مخصوص حالات کے پس منظر میں آیا تھا، جس طرح موجودہ دور میں حالات آگاہ مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آر۔ایس۔ایس کی طرز پر مسلمانوں میں کوئی ایسا ادارہ ہونا چاہیے جو اس تنظیم سے پنجہ آمائی کرسکے۔

ہندی و سنسکرت کی تعلیم کے تعلق سے علامہ شبلیؒ کے دل کو بے چین رکھنے والی فکر اگر شبلیؒ کے بعد بھی مسلم قائدین کو بے کل رکھتی تو آج ہمارے ملک میں دعوت دین کا کام بھی آسان ہوتا، آر۔ایس۔ایس کے نفرت انگیز و زہر آمیز لٹریچر کا جواب بھی بہ حسن وخوبی دیا جاسکتا اور بھارتی سماج میں پھیلائی جانے والی نفرت کی آگ ہمارے لٹریچر کے سامنے سرد ہوتی نظر آتی۔ شبلیؒ کو گذرے ایک صدی ہوگئی، مگر افسوس کہ دفاع اسلام کا یہ محاذ ابھی بھی مسلح سپاہیوں کی راہ دیکھ رہا ہے اور زبانِ حال سے یہ صدا لگا رہا ہے:

کون سی وادی میں ہے؟ کون سے صحرا میں ہے؟
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

☆ **اختصاص کا درجہ:**

اختصاص کا درجہ علامہ شبلیؒ کی اولیات میں سے ہے، شبلی نے سب سے پہلے ندوے کو اس سے متعارف کرایا، پھر ہندوستان کے دیگر مدارس نے بھی اس بدعت حسنہ کو اپنے یہاں رواج دیا، اختصاص (جس کو شبلی تکمیل سے تعبیر کیا کرتے تھے) سے مراد روایتی عرصۂ تعلیم پورا کرنے کے بعد کسی ایک فن میں مہارت پیدا کرنا ہے۔ ندوہ کی تحریک جس دور میں اٹھی اس دور میں مذہبی مدارس میں تکمیل کا کوئی درجہ نہیں تھا، علامہ شبلی نے اسے بھی تعلیم کا نقص قرار دیا اور ۱۸۹۴ء میں ندوہ کے سالانہ اجلاس میں درجۂ تکمیل کی ضرورت کا اظہار کیا، اور فرمایا کہ "ایک نقص نصاب تعلیم میں یہ ہے کہ وہ ایک خاص سلسلہ پر محدود ہے"۔ (خطبات شبلی: ۲۷) اسی طرح ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں لکھا کہ " یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک عام نصاب تعلیم جو دو سو برس ہوئے قائم کیا گیا اس کے ساتھ یہ کسی کو خیال نہ آیا کہ خاص فن کے بالغ العلوم ہونے کا بھی نصاب بنایا جائے اور ان کی جداگانہ تعلیم دی جائے"۔ (حیات شبلی: ۳۴۳)

شبلیؒ کی یہ فکر محض نظریہ کی حد تک نہیں تھی؛ بل کہ انھوں نے اسے عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی؛ چناں چہ ندوہ کی تاسیس کے بعد جب روایتی تعلیم کی آٹھ سالہ مدت پوری ہوئی تو شبلیؒ نے ۱۹۰۹ء میں درجۂ تکمیل کا افتتاح کیا، ابتداءً علم کلام اور علم ادب کا درجۂ تکمیل کھولا، پھر ۱۹۱۲ء میں تفسیر کا درجۂ تکمیل شروع کیا۔ ہندوستان کی طرز تعلیم میں یہ ایک ایسا اضافہ تھا جس نے تعلیم کے معیار کو کافی بلند کیا، ندوہ کے بعد دیگر مدارس میں بھی یہ شعبہ قائم کیا جانے لگا جن میں جامعہ نظامیہ اور دارالعلوم

دیوبند قابل ذکر ہیں۔

درجہ تکمیل کی اہمیت علامہ شبلیؒ کے نزدیک اتنی زیادہ تھی کہ ۱۹۱۳ء میں جب لکھنو چھوڑ کر اعظم گڈھ آئے تو یہاں بھی درجۂ تکمیل قائم کرنے کی فکر دامن گیر رہی، ان کا ارادہ تھا کہ تکمیل کا درجہ قائم کر کے فضلا کو کسی بھی فن میں اختصاص کرایا جائے، شروع میں تفسیر اور ادب کے فن میں درجۂ تکمیل قائم کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا، پھر جب دارالمصنفین کا خاکہ تیار کیا تو اس میں علم کلام مع فلسفہ کے درجہ کا اضافہ کیا۔

☆تربیت تحقیق وتالیف:

علامہ شبلی نہ صرف یہ کہ بلند پایہ مصنف تھے؛ بل کہ مصنف گر بھی تھے، شخصیت سازی ان کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا، استاذ محترم بحرالعلوم مولانا نعمت اللہ اعظمی کے الفاظ میں:

''جہاں تک علامہ شبلیؒ کی شخصیت کا تعلق ہے تو اس میں عظمت کے کتنے ہی پہلو ہیں، وہ تاریخ کے ان چند مردم ساز اساتذہ میں گذرے ہیں جنھوں نے ذوقِ تحریر کی حامل ایک نسل پیدا کی اور اپنے بعد اہل قلم اور اہل علم کی ایک جماعت کو چھوڑا''۔(ابتدائیہ، مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار:۱۳)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ رقم فرماتے ہیں:

''مولانا کی عظمت کے لیے یہی کیا کم تھا کہ وہ اردو کے عظیم ترین مصنفوں میں سے ایک ہوئے ہیں، لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مصنف گر تھے، ایک مجسم ٹکسال تھے جس سے مصنف اور اہل قلم ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے''۔(شبلی انسان، مصنف، مصنف گر، معارف، مارچ ۱۹۶۵ء، ص:۲۰۰)

اسی مقصد کے تحت علامہ شبلیؒ نے الندوہ جاری کیا تاکہ طلبہ وفضلا پرورشِ لوح وقلم کا سلیقہ سیکھ سکیں اور قرطاس وقلم کے میداں کے مسلح غازی بن سکیں، اس کے ساتھ ساتھ فضلا کو تحقیق وتالیف کی باضابطہ تربیت دینے کا خیال بھی شبلیؒ کے ذہن میں ندوہ کی معتمدی کے زمانے سے ہی تھا؛ چناں چہ انھوں نے مارچ ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی میں ندوہ کے لیے جب ایک عظیم کتاب خانہ کی ضرورت کا احساس دلایا تو اس کا بنیادی فائدہ یہ بتایا کہ اس کی وجہ سے تصنیف وتالیف کا بڑے پیمانے پر کام ہوسکتا ہے، شبلیؒ نے اس کتاب خانے کے لیے دار الکتب یا المکتبہ کے بجائے دارالمصنفین کا نام تجویز کیا، یہ نام بھی مولانا کی اس فکر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ محض کتابوں کا ایک ڈھیر جمع کرنا نہیں چاہتے تھے؛ بل کہ ذوقِ تحقیق وتصنیف کی حامل ایک جماعت تیار کرنا چاہتے تھے۔شبلی کے ذہن نے فضلا کی تربیتِ تحقیق وتالیف کا یہ خاکہ ندوہ کے لیے بنایا تھا؛ لیکن قبل اس کے کہ وہ اس خاکہ میں رنگ بھر سکیں ناسازگار حالات کے قلم کا رنگ غالب آگیا اور شبلیؒ بوریا بستر لپیٹ کر آبائی وطن اعظم گڈھ آگئے۔ندوہ چھوڑنے کے بعد بھی وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے رہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں:

''جولائی ۱۹۱۳ء میں جب ندوہ سے الگ ہونے پر مجبور ہوئے تو ادھر سے یکسو ہو کر ان کے ذہن میں ایک تصنیفی ادارے کا خیال زور پکڑنے لگا''۔(حیات شبلی:۵۳۱)

علامہ شبلیؒ کے زمانے میں مدارس میں کتابوں کی تعلیم وتدریس کا تو پورا انتظام تھا؛ لیکن کتابوں کی تصنیف وتحقیق کا کوئی باضابطہ انتظام نہیں تھا، تعلیمی ادارے تو بہت تھے؛ لیکن تحقیق وتالیف کی تربیت کے لیے کوئی ادارہ نہیں تھا؛ اس لیے وہ بہرصورت ایک تصنیفی ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے، ندوہ سے الگ ہونے کے بعد شبلیؒ نے بھوپال کے لٹریری سکریٹری کو ایک مکتوب لکھا جس میں انھوں نے تصنیفی ادارہ قائم کرنے کی بابت اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا:

''بہرحال یہ طے ہولے کہ کہاں صدر مقام کروں تو پھر اربابِ قلم کی تربیت شروع کروں.... ہندوستان میں اور ہر کام کے لیے انجمنیں ہیں؛ لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے، ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دلوں پر حکمرانی کرتا ہے''۔(مکاتیب شبلی:۱/۲۶۰)

درجۂ تکمیل اور درجۂ تصنیف کی فکر علامہ شبلیؒ کو کس قدر تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دار المصنفین کا محل وقوع طے ہونے سے پہلے ہی مولانا نے اپنے لائق شاگردوں کو اس کام میں مساعدت کے لیے خطوط لکھنے شروع کردیے تھے؛ چناں چہ ممبئی کے قیام کے دوران ۱۵؍جون ۱۹۱۴ء کو مولانا مسعود علی ندوی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

''میں چاہتا ہوں کہ دو چار قابل طلبہ اپنے ساتھ رکھوں، کسی فن کی ان کو تکمیل کراؤں، ان میں سے جن میں تصنیف کا مادہ ہو، ان کو تصنیف کے لیے تیار کیا جائے، جو غیر مستطیع ہوں گے ان کے مصارف کا بندوبست ہوگا، اس لیے ایسے طلبہ کی (اگر ہوں اور پسند کریں) ایک فہرست لکھ بھیجو''۔ (مکاتیب شبلی:۲/۱۴۴)

اسی مضمون کا ایک خط ۲۱؍جون کو سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

''ندوہ تو سرِ دست گیا، اب کیا کرنا چاہیے، (ابوالکلام) آزاد سے مشورہ ہوا، رائے یہ ٹھیری کہ اصل غرض قابل اشخاص کا تیار کرنا ہے، اس لیے میں خود دو چار قابل طلبہ اپنے پاس رکھوں اور ان کو کسی فن میں تیار کروں اور صحیح مذاق بھی ان میں پیدا کرایا جائے، ان کے مصارف کا تکفل بھی جن کو ضرورت ہو میرے ذمہ ہوگا''۔ (مکاتیب شبلی:۲/۱۲۶)

علامہ شبلیؒ نے تربیتِ تحقیق وتالیف کا جو خاکہ بنایا تھا وہ کوئی مبہم خاکہ نہ تھا؛ بل کہ اس کے خطوط واضح تھے؛ چناں چہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کے اصول وضوابط یوں ذکر کیے ہیں:

''درجۂ تصنیف:

(۱) اس میں وہ شخص شامل ہوسکے گا جس کو انشا پردازی کا فی الجملہ مذاق ہو اور عربی صرف ونحو کو کافی طور سے جانتا ہو اور ادب میں معمولی استعداد رکھتا ہو۔

(۲) اگر کوئی شخص عمدہ انشا پرداز ہو؛ لیکن عربی زبان سے ناواقف ہو تو اس کو موقع دیا جائے گا کہ عربی زبان حاصل کر سکے۔

(۳) طریقہ تعلیم فن تصنیف:

۱۔ پہلے چھوٹے چھوٹے عنوان دیے جائیں گے اور مضامین لکھوائے جائیں گے۔

۲۔ پھر چھوٹے چھوٹے علمی رسالے لکھوائے جائیں گے۔

۳۔ ہر مضمون کے متعلق اس کے مآخذ بتائے جائیں گے اور تمام مآخذ مہیا کردیے جائیں گے کہ مطالعہ کرسکیں۔

۴۔ پھر جو (یونہی یہ عبارت ناتمام رہ گئی ہے)''۔ (حیات شبلی: ۵۳۵)

علامہ شبلی تحقیق وتالیف کی تربیت کے ساتھ ساتھ کردار وعمل کی تربیت بھی دینا چاہتے تھے، مولانا مسعود علی ندوی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''...قصں لحیہ تو سخت ناگوار ہے، میں صرف تعلیم نہیں؛ بل کہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت دونوں عالمانہ ہو''۔ (مکاتیب شبلی:۲/۱۵۴)

علامہ شبلی نے مولانا مسعود ندوی کو یہ خط ان فضلا کی بابت لکھا تھا جو دار المصنفین اعظم گڈھ آنا چاہتے تھے، مکتوب پر ۱۵؍اکتوبر ۱۹۱۴ء کی تاریخ درج ہے، اس خط پر ابھی ایک مہینہ ہی گذرا تھا کہ فضلا کی آمد سے پہلے فرشتۂ موت کی آمد ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں تیار تھا، قافلہ سالار پر عزم تھا، منزل متعین تھی، بانگِ درا گونجا ہی چاہتی تھی کہ میرِ کارواں راہی ملکِ عدم ہوگیا، اہل کارواں کو اس کا صدمہ ضرور ہوا؛ لیکن یہ صدمہ ان کی راہ میں حائل نہ ہوسکا، شبلیؒ کے لائق وفائق شاگردوں نے شبلیؒ سے حاصل ہونے والی مذاق تحقیق وسلیقہ تصنیف کی میراث کو توشہ راہ بنا کر اس کارواں کو ایسی کمالِ مہارت اور تیز رفتاری سے جادہ پیما کیا کہ سنگِ راہ دونیم ہوئے، غبار کارواں سے کارواں کی عظمت وعزیمت کا پتہ چلا اور ایسے نقوش ثبت ہوئے کہ آج بھی ان کے نشان قدم منزل کا

سراغ دیتے ہیں۔

یہ وہ علوم وفنون اور وہ تعلیمی امور ہیں جن سے اس دور کے مدارسِ اسلامیہ کا نصابِ درس ونظامِ تعلیم نا آشنا تھا، علامہ شبلیؒ نے اپنی عالمانہ بصیرت، مفکرانہ دوررسی اور قائدانہ زمانہ شناسی سے ان علوم وفنون اوران اضافی امور کی اہمیت کا ادراک کرلیا تھا؛ چناں چہ شبلیؒ نے جہاں نظریاتی طور پر ان کی اہمیت سے اہلِ مدارس اور خصوصا اربابِ ندوہ کو روشناس کرایا؛ وہیں عملی وتطبیقی شکل میں ان کو نصاب کا حصہ بنانے کی کوشش کرتے رہے اور وہ اس کے لیے (مولانا سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں) ندوہ کی در و دیوار سے ٹکراتے رہے۔

اوپر ذکر کیے گئے درسی موضوعات وتعلیمی امور میں سے شروع کے تین موضوعات: انگریزی، جدید علوم وفنون اور جدید علمِ کلام کو تو شبلیؒ رائج موضوعاتِ درس کے ساتھ لازمی مضمون کی حیثیت سے داخلِ نصاب کرنے کے خواہی تھے اور اس کے لیے انھوں نے اپنی معتمدی کے دور میں حتی الامکان کوشش بھی کی، اور اخیر کے دو امور: تکمیل اور تربیتِ تحقیق وتالیف کو شبلیؒ نے روایتی مدتِ تعلیم مکمل ہونے کے بعد اعلی تعلیم کے طور پر تجویز کیا تھا، اور بقیہ دو موضوعات: ہندی وسنسکرت اور تاریخ کے لیے انھوں نے الگ سے شعبے قائم کیے تھے۔

علامہ شبلیؒ نے ان علوم وفنون اور ان اضافی نصابی امور کا تصور دے کر مدارسِ اسلامیہ کے نصابِ درس کو ایک انقلابی رخ دیا، آفاقی وسعت عطا کی، حاملانِ علومِ نبوت کو مغربی وآریائی حملوں سے آگہی کی صلاحیت اور ان سے نمٹنے کا حوصلہ دیا، لسانِ قوم کو اسلام کی ترجمانی کے لیے سیکھنے پر ابھارا، تحقیق کا جذبہ پیدا کیا، فضلا کو تصنیف کا چسکہ لگایا، کسی بھی فن میں اختصاص کا موقع فراہم کیا، غرضے کہ نصابِ درس میں ایک نئی روح پھونک دی، لہذا اختصاص کے شعبے ہوں یا انگریزی زبان کے گھنٹے، جدید علوم وفنون کی تدریس ہو یا جدید علمِ کلام مدون کرنے کی تجویز، تحقیق وتالیف کی تربیت ہو یا بہ طور مطالعہ تاریخ کا موضوع، آریوں اور سناتن دھرمیوں سے نمٹنے کے لیے خصوصی درسگاہوں کا قیام ہو یا مغربی حملوں کا جواب دینے کے لیے طلبہ وفضلا کی تربیت، سب کا سرِ رشتہ علامہ شبلیؒ کی فکر سے جڑتا نظر آتا ہے۔

(نوٹ: یہ وہ امور ہیں جن کا تعلق نصاب میں اضافے سے ہے، رائج نصاب میں اصلاح سے متعلق امور پر اگلی قسط میں روشنی ڈالی جائے گی۔ ان شاء اللہ)

(جاری)

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's
یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India

غزلیات

علامہ شبلی نعمانیؒ

اثر کے پیچھے دل حزیں نے نشاں چھوڑا نہ ہر کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا
بھلی تھی تقدیر یا بُری تھی، یہ راز کس طرح سے عیاں ہے
بتوں کو سجدے کیے ہیں اتنے کہ مٹ گیا سب لکھا جبیں کا
وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہوگی، ابھی تو سن ہی نہیں نہیں کا
یہ نظم آئیں، یہ طرز بندش، سخنوری ہے، فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرزِ علی حزیں کا

(۱)

تیر قاتل کا یہ احسان رہ گیا
جائے دل سینہ میں پیکاں رہ گیا
کی ذرا دست جنوں نے کو تہی
چاک آکر تابدا ماں رہ گیا
دو قدم چل کر تری وحشی کے ساتھ
جادۂ راہ بیابان رہ گیا
یاد رکھنا دوستو اس بزم میں
آکے شبلی بھی غزل خواں رہ گیا

(۲)

پوچھتے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا
رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھا
شب فرقت میں دل غمزدہ بھی پاس نہ تھا
وہ بھی کیا رات تھی کیا عالم تنہائی تھا

(۳)

تمیں دن کے لیے ترک ہے و ساقی کرلوں
واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں
پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد تیری خاطر سے میں یہ بھی کرلوں

(۴)

ناتواں عشق نے آخر کیا ایسا ہم کو
غم اٹھانے کا بھی باقی نہیں یارا ہم کو
درد فرقت سے تری صفت ہے ایسا ہم کو
خواب میں بھی ترے دشوار ہے آنا ہم کو

(۵)

کچھ اکیلی نہیں میری قسمت
غم کو بھی ساتھ لگا لائی ہے
منتظر دیر سے تھے تم میرے
اب جو تشریف صبا لائی ہے
شبلی زار سے کہہ دے کوئی
مژدہ وصل صبا لائی ہے

(۶)

یار کو رغبت اغیار نہ ہونے پائے
گل تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے
اس میں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ
شکوہ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے
آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن
حالِ دل دیکھے اظہار نہ ہونے پائے

حکیم وسیم احمد اعظمی
لکھنؤ (اتر پردیش)

شبلی، مکاتیبِ شبلی اور ندوۃ العلما: ایک مطالعہ

ڈاکٹر عمیر منظر (ابوعمیر، پیدائش: ۵/ مئی ۱۹۷۴ء) اردو ادب کے کئی خلاء کو پُر کرنے کی سعی کرنے والے سنجیدہ فکر محقق، ناقد، شاعر اور ناظمِ مشاعرہ ہیں۔ زبان وادب کی ترسیل و ابلاغ میں حزم واحتیاط پر شدت سے عامل ہیں، طبعاً دیانت دار اور مزاجاً بے حد محتاط واقع ہوئے ہیں۔ زیر نظر کتاب 'شبلی، مکاتیبِ شبلی اور ندوۃ العلما' حقائق اشیاء تک پہنچنے کے لیے سب سے معتبر دستاویز ہے اور جو ایصال الی المطلوب میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ڈاکٹر عمیر منظر اپنی اس کتاب کی ترتیب وتدوین کے طریقۂ کار کے بارے میں لکھتے ہیں:

"—— شبلی کے اُن خطوط کو ترتیب وار یکجا کیا گیا ہے، جن کا تعلق ندوۃ العلما، الندوہ اور اس کے متعلقات سے ہے۔ مکمل خط کے بجائے خط کا صرف وہ حصّہ نقل کیا گیا ہے، جس کا تعلق

موضوع زیر بحث سے ہے۔ البتہ بہت سے خطوط ایسے بھی ہیں جنہیں مکمل نقل کیا گیا ہے۔ آداب والقاب کو حذف کر دیا گیا ہے۔ وہ خطوط جن کی تاریخ مذکور نہیں ہے، انہیں سب سے آخر

میں جگہ دی گئی ہے۔" (شبلی، مکاتیبِ شبلی اور ندوۃ العلما، ص ۲۰)

اِس کتاب میں شبلیؒ کے کل ایک سو اڑسٹھ (۱۶۸) خطوط شامل ہیں، جن میں ایک سو اکسٹھ (۱۶۱) خطوط مورخ (باتاریخ) ہیں اور جو ۱۸۹۵ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیان لکھے گئے ہیں اور سات (۷) غیر مورخ (بلا تاریخ) ہیں۔ اس کتاب میں شامل پہلا خط مولانا محمد علی مونگیریؒ کے نام ہے، جو ۱۴/ مئی ۱۸۹۵ء کو لکھا گیا ہے اور ندوۃ العلما اور ندوہ کے حوالے سے سنوی ترتیب کا پہلا خط ہے اور آخری خط وفات سے ایک ماہ پانچ دن قبل منشی محمد امین کے نام ۱۳/ ۱/ اکتوبر ۱۹۱۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر کے مطابق جو سات خطوط غیر مورخ ہیں، ان میں ایک خط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام، دو صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں کے نام، ایک ایم مہدی حسن کے نام، ایک مولوی بشیر الدین کے نام، ایک مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام اور ایک مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام ہے۔ یہ ساتواں خط جو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام ہے، کسی سنہ ہجری کی بائیسویں رمضان المبارک کو لکھا گیا ہے۔

واضح رہے کہ زیر نظر کتاب میں شبلیؒ کے صرف چھ (۶) خطوط ہی غیر مورخ (بلا تاریخ) ہیں، کیوں کہ ڈاکٹر عمیر منظر نے "وہ خطوط جن پر تاریخ درج نہیں ہے" کے زیر عنوان مکاتیب شبلی، حصّہ اوّل، صفحہ ۲۴۹ کے حوالہ سے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام جس غیر مورخ خط کو اپنی کتاب (شبلی، مکاتیبِ شبلی اور ندوۃ العلما) کے صفحہ ۱۴۵ پر نقل کیا ہے وہ مورخ (باتاریخا) ہے اور ۱۶ جون ۱۹۱۴ء کو اکبر بلڈنگ، بھائی کلہ، بمبئی سے مولانا عبد

الماجد دریابادی کے نام لکھا گیا ہے۔اس خط کو خود ڈاکٹر عمیر منظر نے اپنی اِسی کتاب کے صفحہ ۱۳۹ پر مکتوباتِ شبلی، صفحہ ۲۱۳ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔اس طرح ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس کتاب میں ندوہ اور رسالہ الندوہ کے حوالے سے ایک سو اَڑسٹھ (۱۶۸) کی بجائے ایک سو سڑسٹھ (۱۶۷) خطوط شامل ہیں۔

یہ خطوط مولانا محمد علی مونگیری، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مسٹر محمد اسحاق، مولانا ابوالکلام آزاد، صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں، مولانا حمید الدین فراہی، ملا عبدالقیوم حیدرآبادی، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری، مولوی سید ولی الحق، قاضی محمد خلیل، مولانا سید سلیمان ندوی، ایڈیٹر جرائدِ اسلامیہ، شمس العلماء خواجہ حسن نظامی، شیخ رشید الدین انصاری، ایم مہدی حسن، مولوی محمد ریاض حسن خاں خیال، عطیہ بیگم فیضی، منشی محمد امین زبیری، زہرا بیگم فیضی، مولوی بشیر الدین، مفتی شیر علی، مولوی ضیاء الحسن ندوی، مولوی سید ممتاز علی، مولانا سید عبدالحی، مولوی قیام الدین بخت جون پوری، مرزا محمد سلیم، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، پیارے لال شاکر میرٹھی، طلبائے دار العلوم ندوۃ العلما، شمس العلما مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، پروفیسر مولوی سید نواب علی، مولوی مسعود علی، ابوالکمال سید عبدالحکیم دسنوی، نائب ناظم ندوہ اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام لکھے گئے ہیں۔ان ایک سو سڑسٹھ (۱۶۷) خطوط میں بھی سب سے زیادہ اکیاون (۵۱) خطوط مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ہیں۔پندرہ (۱۵) خطوط مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اور دس (۱۰) مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ہیں۔

گویا ڈاکٹر عمیر منظر نے اپنی اس کتاب (سن اشاعت: ۲۰۱۵ء) میں ایسے ایک سو سڑسٹھ (۱۶۷) خطوط کی نشان دہی کی ہے، جن میں ندوۃ العلما یا الندوہ یا دونوں کا ذکر آیا ہے۔ ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے مولانا سید سلیمان ندوی کی مکاتیبِ شبلی اوّل (۴۰۰ خطوط، سن اشاعت: ۲۰۱۰ء)، مکاتیبِ شبلی دوم (۳۷۹ خطوط، سن اشاعت: ۲۰۱۲ء)، مولوی امین زبیری کی خطوطِ شبلی (۱۰۳ خطوط، سن اشاعت: ۲۰۱۷ء) اور مکتوباتِ شبلی (۲۰۹ خطوط، سن اشاعت: ۲۰۱۲ء) کے حوالہ سے شبلی کے ۱۰۹۱ خطوط کی نشاندہی کی تھی اور نوادراتِ شبلی (سنِ اشاعت: ۲۰۱۷ء) میں
چوبیس (۲۴) نئے خطوط شامل کر کے یہ تعداد گیارہ سو پندرہ (۱۱۱۵) تک پہنچادی تھی۔نوادراتِ شبلی کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے تین مزید خطوط دریافت کیے ہیں، چنانچہ ان کی ۱۳/ جولائی ۲۰۱۸ء تک کی تحقیق کے مطابق شبلی کے ایک ہزار ایک سو اٹھارہ (۱۱۱۸) خطوط دریافت ہو چکے ہیں اور اُنہوں نے نوادراتِ شبلی میں جن چوبیس (۲۴) خطوط کی نشادہی کی ہے، ان میں سے چھ (۶) خطوط میں ندوۃ العلما یا رسالہ الندوہ یا دونوں کا ذکر ہے۔ان میں سے ایک خط کسی نامعلوم الاسم شخص کو لکھا گیا ہے، جس کو روداد اجلاس ہفتم ندوۃ العلما، دسمبر ۱۹۰۱ء، ص ۱۰ کے حوالہ سے اِس کتاب (نوادراتِ شبلی) میں شامل کیا گیا ہے۔ایک خط مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ہے، جو اگست ۱۹۰۲ء کی کسی تاریخ کو لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے نوادراتِ شبلی میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں کے جس دوسرے خط کی نشاندہی حیاتِ شبلی، ص ۵۱۹۔۵۱۸ کے حوالہ سے کی ہے، اس خط کا ذکر ڈاکٹر عمیر منظر نے 'علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط' ص ۲۰۔۱۹ کے حوالہ سے کیا ہے۔دو خطوط مولانا سید عبدالحی حسنی کے نام ہیں، جو علی الترتیب ۱۴ جون ۱۹۱۰ء اور ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو لکھے گئے ہیں۔ایک خط نائب ناظم ندوہ کے نام ہے، جو ۲۵ مئی ۱۹۱۴ء کو لکھا گیا ہے۔مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ثانی الذکر خط کو وضع کرنے کے بعد شبلی کے پانچ (۵) ایسے مزید خطوط دریافت ہوئے ہیں، جن میں ندوۃ العلما یا رسالہ الندوہ یا دونوں کا ذکر ہے۔اس طرح یہ تعداد ایک سو بہتر (۱۷۲) تک پہنچ جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے پاس جو تین (۳) نو دریافت خطوط

ہیں،ان میں ندوۃ العلما یا الندوہ کا ذکر ہے یا نہیں،اس کا ہمیں علم نہیں ہے۔بہر کیف خطوط کی یہ غیر معمولی تعداد ندوۃ العلما اور رسالہ الندوہ سے شبلی کے ربط و تعلق اور فکر مندی کو ظاہر کرتی ہے۔

ڈاکٹر عمیر منظر نے زیر نظر کتاب میں صرف ندوۃ العلما اور رسالہ الندوہ سے متعلق شبلیؒ کے خطوط کو یکجا کرنے کا ہی کام نہیں کیا ہے، بلکہ ان پر بیش قدر حواشی لکھ کر اور شبلیؒ کے مکتوب الیہم کا اجمالی تعارف کرا کے قاری کو ان سے یک گونہ ربط و تعلق کا احساس دلایا ہے، جس سے اس کتاب کی افادیت دو چند ہو جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”—— ان افراد کے حالات جمع کرنے میں خاصا وقت صرف بھی ہوا اور دقت بھی پیش آئی۔اس لیے کہ ایک صدی پہلے کے حالات کم یاب ہیں۔یہ بھی کوشش رہی ہے کہ ان افراد کے ضروری حالات مستند حوالوں کے ساتھ تحریر کیے جائیں“۔ (ابتدائیہ،ص ۲۱)

دراصل ڈاکٹر عمیر منظر نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا خاکہ بڑی دانشوری سے تیار کیا ہے اور اس کے بیانیہ میں عصری تحقیقی اسلوب اختیار کیا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تعارف کے بعد شبلیؒ کا مکتوب الیہ جانا پہچانا اور بے حد اپنا لگتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلیؒ کا مکتوب الیہ ہمارا اپنا مکتوب الیہ ہے اور ہم اس سے اپنے حال، احوال اور قرآن و حدیث کے نکات اور ملک و ملت مسائل بیان کر رہے ہوں۔شبلیؒ اپنے خطوط کی ادبی حیثیت کو ذرا بھی اہمیت نہ دیتے تھے، لیکن آج ان کے یہی خطوط مکتوباتی اردو ادب کا اہم سرمایہ تصور کیے جاتے ہیں اور شبلیؒ کے نظریات و فکریات اور ہم عصروں سے ان کے ربط و تعلق کا ایک معتبر حوالہ قرار پائے ہیں نیز ان سے اُس وقت کے حالات اور ندوۃ العلما کے مالہ وما علیہ کے فہم و ادراک میں براہ راست مدد ملتی ہے۔

ان خطوط میں شبلیؒ کو ندوۃ العلما کے کی تاسیس،اس کے عمومی استحکام،اس کے لیے زمین کی فراہمی کے لیے تگ و دو، مستقل آمدنی کے ذرائع کی تلاش کے لیے فکر مندی اور جد و جہد، ندوہ کے ذمہ داروں کے مخصوص طرز فکر پر نقد اور غیر آئینی طریقۂ کار پر احتجاج، نصاب تعلیم میں ترمیم و اصلاح، طلباء کی ذہنی و فکری اور مذہبی تربیت پر صلاح و مشورہ، احباب سے صلح و مصالحت کی تدبیریں اور رسالہ الندوہ کے اجراء کی مساعی میں جان گزا اور جاں گسل ہوتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ان خطوط میں مجھے شبلی کہیں بھی اور کسی مرحلے میں بھی بہت زیادہ پُرسکون نظر نہیں آئے، بلکہ صلاحیتوں کے عدم اعتراف اور شخصی عدم اعتماد کے کرب اور آزار میں مبتلا دکھائی دیے۔ان کے علم پر انگشت نمائی تو نہیں کی گئی، لیکن ان کے اعمال میں تصوف بیزاری کے عناصر تلاشنے کی کوششیں ضرور ہوئیں اور اُن کی تمام تر سرگرمیوں کو اسی میزان میں تولا گیا۔یہ باتیں میں اس اعتراف کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ میں نے شبلیؒ کو بہت زیادہ پڑھا نہیں ہے، لیکن زیر بحث موضوع پر شبلی کے اِن خطوط نے یکجا، یک موضوعی لوازمے فراہم کر دیے ہیں، جس میں سارا ندوۃ العلما اپنے متعلقات و ملحقات کے ساتھ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ان نا مساعد حالات سے شبلیؒ آزردہ بھی ہوئے ہیں اور دل برداشتہ بھی، لیکن وہ بڑے مستحکم اور غیر معمولی عزم و ارادہ والے بھی نظر آئے ہیں، غالباً اُن کی زندگی کا حسن ان کی پریشانیوں میں پوشیدہ تھا،اسی لیے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو درجنوں خط لکھ کر موضوع اور مسائل کی اہمیت کا احساس کراتے رہے ہیں۔دراصل شبلیؒ کا واسطہ ایسے تقدس مآبوں اور برگزیدہ بندوں سے تھا، جن کی تہذیب و معاشرت کے کسی بھی خانے میں وہ منطبق نہیں ہو پاتے تھے۔کتاب میں شامل پہلا مکتوب بنام مولانا محمد علی مونگیریؒ بڑا چشم کشا ہے، شبلی کو اپنے ناکردہ کی صفائی دیتے ہوئے جس کرب سے گزرنا پڑا ہے،اس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے،وہ مولانا محمد علی مونگیریؒ کو لکھتے ہیں:

”خط پہنچا، مجھ کو افسوس ہے کہ آپ ایک مسلمان کی بات کا

اعتبار نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے بلا خیال میگزین میں مضمون دے دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ پارسال کی دیری کی وجہ سیتو نے ایسا کیا۔ بخدائے لایزال مجھ کو پارسال کا تصور تک نہ آیا تھا‘‘۔ (مکتوب بنام مولانا محمد علی مونگیریؒ، بحوالہ شبلی، مکاتیبِ شبلی اور ندوۃ العلما، ص ۲۴)

اس گلہ شکوہ کے بعد شبلیؒ فوراً اصل مقصد پر آجاتے ہیں اور ندوہ کی منتقلی پر جو مختلف آراء سامنے آئی تھیں، ان کے علی الرغم وہ اپنی رائے کو استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں، قطع نظر اس کے کہ تقدس مآبوں پر کیا گزرے گی۔

’’ــــ دارالعلوم کا قائم ہونا کان پور میں کسی طرح نہیں ہوسکتا، فیضِ عام کے نام کے ساتھ دارالعلوم کا مستقل خیال ہرگز لوگوں کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ نہ کوئی نیا جوش طبائع میں پیدا ہوگا، جس کی وجہ سے چندہ کی زرِ کثیر کی توقع کی جائے۔ حافظ صاحب میرے بھی دوست ہیں، لیکن ان کی خاطر تمام مسلمانوں کے فائدہ کی بات کھوئی نہیں جاسکتی۔ فیض عام کا نام لیا جائے تو فوراً بدگمانی پھیل جائے گی کہ ندوہ صرف فیضِ عام کے فائدہ کی غرض سے قائم ہوا تھا۔ کلکتہ میں ندوہ کا جانا بالکل بے فائدہ ہے۔ اِدھر کے علماء تو وہاں تک پہنچ نہیں سکتے، اُدھر کے علماء جب تک جاگیں، یہاں کے جاگے ہوئے سو جائیں گے۔ اس کے علاوہ وہاں کے مسلمان چنداں مال دار نہیں۔ کلکتہ سے تو پٹنہ بہتر ہے۔ لیکن میں تو حیدرآباد کے سوا اور کسی جگہ کا نام نہیں لے سکتا۔ دارالعلوم کی تجویز وہیں سے پوری ہوسکتی ہے‘‘۔ (مکتوب بنام مولانا محمد علی مونگیری، بحوالہ سابق، ص ۲۴)

مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۹۵ء کے اپنے ایک مکتوب میں حجاج کے بارے میں بعض ذمہ دارانِ ندوہ کے موقف کے خلاف مولانا محمد علی مونگیریؒ کو لکھتے ہیں:

’’ــــ جس وقت یہ عام طور پر معلوم ہوجائے گا کہ ندوہ میں پولیٹیکل بحثیں پیش ہوتی ہیں۔ قطعی سمجھ لیجیے کہ کل علماء متفق ہوکر بھی ندوہ کو نہیں چلاسکتے۔ آپ کے اراکینِ انتظامیہ میں سے تمام عہدہ دارانِ سرکاری وممبران میونسپل وغیرہ مستعفی ہوجائیں گے اور جلسوں میں کسی کو مجال شرکت نہ ہوگی‘‘۔ (مکتوب بنام مولانا محمد علی مونگیری، بحوالہ سابق، ص ۲۵)

شبلی نے یہ خطوط کسی عام انسان کو نہیں لکھے تھے، بلکہ ندوہ العلما کی یہ سب سے برگزیدہ اور تقدس مآب شخصیت کو لکھے تھے، یہ بدیہی سچائی ہے کہ علم وادب میں شبلیؒ کا مرتبہ اُن سے بہت بلند تھا، غالباً جس سے تحفظی تدارک کے لیے شبلی میں روحانیت کی کمی تلاشی گئی تھی۔ جب اس سے بھی کام نہیں چلا اور جب کچھ تقدس مآبوں کو اندیشہ ہوا کہ شبلیؒ بانیٔ ندوۃ العلما قرار دیے جانے لگے ہیں تو ایک حکمتِ عملی کے تحت برسرِ منبر مولانا محمد علی مونگیریؒ کی روحانیت اور راہِ سلوک میں ان کے مرتبۂ بلند کے تذکرے کیے جانے لگے۔ سید سلیمان ندوی کی ’حیاتِ شبلی‘ سے شبلیؒ کی علمی توقیت ہونے لگی پھر ’’سیرت مولانا محمد علی مونگیری‘‘ لکھ کر اس کے سدِ باب کی تدبیریں ہوئیں۔ لیکن دستاویزی حقیقت یہی ہے کہ ہم نفسانِ ندوہ میں علمی اعتبار سے سب سے بلند مقام ومرتبہ شبلی کا تھا۔ اسی لیے بڑے منظم انداز میں ان کی آراء سے صرفِ نظر کیا جانے لگا اور انہیں انتہائی چھوٹے چھوٹے مسائل میں اُلجھانے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ ایسا بھی نہیں کہ ان برگزیدہ بندوں میں باہم اخوت اور سلسلۃ الذہب کا تعلق تھا، بلکہ ان میں بھی شدید اختلافات تھے، جن کا کسی اسلامی، آفاقی نظریے سے کوئی سروکار نہ تھا، بس یہ اتحادِ معاملاتِ ندوہ سے شبلی کی بے دخلی کے لیے تھا، گویا روحانیت کے لباسِ حریر میں یہ کھیل تماشے ایک بلند قامت علمی شخصیت پر قابو پانے کے لیے ہوا کرتے تھے۔

شبلی کے ان خطوط کو پڑھ کر اوّل وہلہ جو تأثر قائم ہوتا ہے، وہ مفکر، دانش ور، جرأت مند، بے باک اور مصلحت نا آشنا شخص کا ہوتا ہے۔ سچ بھی یہی ہے کہ شبلی جس بات کو صحیح تصور کرتے تھے اس کے برمحل اظہار اور بروقت نفاذ پر ’پیہم اصرار‘ کیا کرتے تھے۔ دراصل ان کا عزم، عزم بالجزم ہوتا تھا۔ سچ کہنے میں کسی طرح کی مصلحت ان کا نہ تو راستہ روک سکتی تھی اور نہ ہی کسی نوع

کی مصالحت مقصدِ اصلی سے انہیں منحرف کرسکتی تھی۔ یہی غالباً شبلی کے مزاج کا خاصہ تھا، جو انہیں ہمیشہ مضطرب کیے رہتا تھا۔

ہم عصروں میں شبلیؒ کی حیثیت ایک ماہرِ تعلیم کی تھی۔ انہوں نے محض تیس سال کی عمر میں ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ کی شاہی بارہ دری میں اپنے مقالہ 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' میں اپنا حاصلِ مطالعہ پیش کر کے اہلِ علم و دانش کو حیرت میں ڈال دیا تھا اور یہی مقالہ علمی دنیا میں باب الداخلہ بھی قرار پایا تھا۔ اُنہوں نے ۱۸۹۲ء میں روم، مصر اور شام کا علمی سفر کیا اور وہاں کے طرزِ تعلیم اور معیارِ تعلیم کا تجزیاتی مطالعہ کیا تھا اور اپنے سفرنامہ میں وہاں کے تعلیمی انحطاط کی داستان لکھ کر اہلِ فکر و نظر کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بالخصوص جامعہ ازہر، مصر کے حالات نے انہیں سب سے زیادہ مضطرب کیا تھا۔ وہاں کے طلباء کا حال اس ادارہ کی عظمت پر گہن ڈال رہا تھا۔ مصر کے المنار نے شبلیؒ کے تعلیمی نظریات کی توسیع و تشہیر میں بڑی مدد کی اور شیخ رشید رضا مصری نے بھی ۱۸۹۹ء میں اس موضوع پر المنار میں متعدد مضامین لکھے۔ ۳۰ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ مطابق ۵ نومبر ۱۸۹۹ء کے المنار میں اُنہوں نے جامعہ ازہر مصر کی اصلاحی تحریک کے سلسلہ میں دنیائے اسلام کے جو تین نام بطور سند پیش کیے تھے، ان میں ایک شبلیؒ بھی تھے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے بھی اپنے ابتدائیہ میں تاریخ ندوہ، حصۂ اوّل کے حوالہ سے اس ذکر کیا ہے۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے دسمبر ۲۰۱۳ء کے شمارہ میں شبلیؒ کے ایک مراسلہ کی نشان دہی کی ہے، جو ۲۲ مئی ۱۹۱۳ء کے زمین دار میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مطابق ۱۹۱۳ء میں جامعہ مدینہ منورہ کے نظام و نصابِ تعلیم کی اصلاح و تدوین کے لیے ہندوستان سے جن اہلِ علم کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، اُن میں شبلیؒ کے ساتھ مولانا حمید الدین فراہیؒ اور علامہ محمد اقبالؒ بھی تھے۔ شبلیؒ نے یہ مراسلہ چھپوا کر 'حضرات علما اور اربابِ تعلیمِ جدید سے اظہارِ رائے کی درخواست' کی تھی۔ اس مراسلہ میں انہوں نے بیس مختلف عناوین پر غور و فکر کے لیے توجہ دلائی تھی اور لکھا تھا:

''میں سمجھتا ہوں کہ اصولی اور اہم امور کے متعلق عنوانات قائم کر دیے جائیں اور ان کے متعلق اظہارِ رائے کی درخواست کی جائے''۔ (بحوالہ نوادراتِ شبلی، ص ۱۷۶)

ہندوستان کے متعدد تعلیمی اداروں اور ان کی تعلیمی و نصابی کمیٹیوں سے مختلف حیثیتوں سے شبلیؒ کی وابستگی کی طرف ڈاکٹر عمیر منظر نے بھی اشارے کیے ہیں۔ وہ بھوپال میں عربی مدارس کی تنظیم 'نظارۃ المعارف' کے رکن مقرر ہوئے اور وہاں کا 'نصابِ تعلیم اور نظام الاوقات' اور 'دستور العمل وہدایات برائے مدرسین' تیار کیا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے تعلیمی معیار کو مزید بلند کرنے کے لیے لفٹنٹ گورنر نے کلکتہ آنے کی دعوت دی۔ اسی سال سرکار آصفیہ حیدر آباد کے ناظم سررشتۂ علوم و فنون مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں حکومت حیدر آباد دکن نے علومِ مشرقیہ کی یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ کیا تو انہیں نصاب کی تیاری کا کام سپرد ہوا اور یہ نصابِ تعلیم ۱۷ فروری ۱۹۰۹ء کو حکومت نے منظور کیا۔ ۱۹۱۲ء میں ڈھاکہ میں یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش ہوئی تو شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کی سب کمیٹی کا انہیں رکن نامزد کیا گیا۔ جب انگریزی حکومت نے الہ آباد یونیورسٹی کے بی اے تعلیمی کورس سے فارسی خارج کر دی تو شبلی شناس ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے بقول:

''..... علامہ شبلی نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے موقف کی تائید میں محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس کے تیرہویں سالانہ اجلاس میں زبردست تقریر کی۔ خود گورنر بنگال سر جان ووڈبرن نے

نہایت غور سے ان کی تقریر سنی۔ مسٹر محمد شفیع، مسٹر محمد عبد الرحمٰن اور نواب محسن الملک نے بھی علامہ کی تائید کی اور بالاتفاق یہ قرار داد پاس ہوئی''۔ (بحوالہ نوادراتِ شبلی، ص ۱۷۱)

غالباً اسی کے بعد الہ آباد یونیورسٹی نے شبلی کو بورڈ آف اسٹڈیز کا

ممبر منتخب کیا تھا، جہاں انہوں نے یونیورسٹی کے فارسی نصاب کی تجویز پیش کی اور انٹرنس، انٹرمیڈیٹ اور بی اے کورس فارسی تیار کیا تھا۔ غرض شبلی نے ۱۸۸۷ء میں 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' لکھ کر جو باب الداخلہ کھولا تھا اور اس بابت جو اختراعی فکر اختیار کی تھی، اس کی بازگشت ہندوستان کے ساتھ بعض دوسرے ملکوں میں بھی سنائی دینے لگی تھی اور اس طرح شبلی شناسی کے بین الاقوامی سلسلہ کا آغاز ہوا۔ علی گڑھ اور حیدرآباد کے بعد لکھنؤ کے وہ جس ماحول میں رہے، وہاں اس قد و قامت کا کوئی اور نہ تھا، اور کچھ ہوتے تو یقیناً شبلی اس قدر پریشان نہ کیے جاتے۔

غور فرمایئے! سر سید احمد خاں نے جس شبلی کو ۱۸۸۳ء میں اور شیخ رشید رضا مصری نے ۱۸۹۹ء میں پہچان لیا تھا، اس کو برگزیدگانِ ندوہ نے ۱۹۰۵ء میں بدقت تمام، آدھا ادھورا پہچانا اور غالباً بدرجۂ مجبوری پہچانا۔ یہ 'پہچان' بھی شبلی کی سالہا سال کی جدوجہد اور تسلیم کی خو ڈلوانے کی شبانہ روز کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ بات محض دانشوری کے معیار اور میزان کی تھی۔ ایک اپنے برگزیدہ مصاحبوں سے اخلاقی، آئینی اور اسلامی معیار کا متقاضی تھا تو برگزیدہ مصاحبین بہ ظرفِ خود روحانی میزان لیے بیٹھے تھے اور اس میں 'علم و دانش' کے ساتھ کے ساتھ ہی نو مسلمیت، ذات برادری اور تقوی و روحانیت کو بھی تولنے کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ جب کہ اس میزان کے بعض اَوزان اسلامی تعلیمات کے صریحاً منافی تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی حمیت اور بے حد جرأت و جسارت سے کام لیتے ہوئے اگر شبلی کی تحریروں، بالخصوص اُن کے خطوط اور ان کے برگزیدہ مصاحبین اور ان کے متعلقین کی تحریروں کا تجزیہ --- اور خود ان اکابرِ ملت کی تحلیل نفسی کی جائے اور جو کچھ سامنے آئے 'بسوزد پرم' کے اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا ہوئے بغیر سچ اور حق لکھ دیا جائے تو بحث و نظر کے بہت سے بند دروازے کھل جائیں گے ۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے 'شبلی، مکاتیب شبلی اور ندوۃ العلما' میں شبلی، ندوۃ العلما، اور ان کے متعلقات اور ملحقات کو یک جا کر کے ایک آئینہ فراہم کر دیا ہے۔ جس میں مآلِ سعیِ اسکندر کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور یقین جانیے شبلی کے بدن پر اسلامی روحانیت کا لباس حریر ملے گا۔ مجھے حیرت ہے کہ شبلی شناسوں نے مصلحت کی چادر کیوں اُوڑھ رکھی ہے؟ اور کب تک شبلی کی شخصیت کو مجروح ہوتے دیکھتے رہیں گے۔ میں شکر گذار ہوں ڈاکٹر عمیر منظر کا، جنھوں نے ندوۃ العلما اور رسالہ الندوہ کے حوالے سے شبلی کے خطوط کو یکجا کر کے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا ہے۔

شبلی کے مزاج میں 'عقیدتِ محض' نام کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ ان کے اجداد یقیناً بت پرست تھے، جس کی نسبت کو اُن کے دادا نے اسلام قبول کر کے عملاً مسترد کر دیا تھا، لیکن شبلی کے بعض معاصر علماء نے اسلام کی روشن تاریخ سے استشہاد کی بجائے اس کو شبلی کی شخصیت کی تعمیر میں ایک آنچ کی کمی قرار دیا اور موقع بہ موقع ان کو اس کا احساس دلاتے رہے۔ دراصل شبلی اپنے معاصر علماء کی طرح غالباً نام نہاد بیش قیمت غیر ملکی 'استخواں' نہیں رکھتے تھے، اسی لیے وہ چاہ کر بھی اپنے ہم عصروں کی طرح 'استخواں فروشی' نہیں کر سکتے تھے۔ اسی غیر اسلامی 'نظریۂ استخواں' کو برگزیدہ جماعت ایک 'کارگر حربہ' کے طور پر استعمال کرتی تھی اور شبلی کے دینی اعمال میں روحانیت اور صوفیانہ عناصر کی کمی کا الزام دھر کر اپنے دَرکتے قلعہ کو مضبوط کرنے کی سعی کیا کرتے تھی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس غیر اسلامی فکر پر آج بھی عمل ہو رہا ہے بڑی شدت سے ہو رہا ہے اور آج بھی شبلی صفت لوگ ان برگزیدہ بندوں کا اوّلین ہدف ہیں۔ غور فرمایئے! ایک شخص مستشرقین کی فتنہ سامانیوں کا علی رؤس الاشہاد جواب دے رہا ہو، مسلمانوں کے سامنے ان کا روشن ماضی پیش کر کے حال کی تعمیر اور مستقبل کے تدبیری نکات سمجھا رہا ہو اور اپنے اُوپر لگنے والے غیر متصوفانہ عمل اور روحانیت کی کمی کے اتہام کے علی الرغم 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' اور 'الفاروق' اور 'سیرت النبی ﷺ' لکھ رہا ہو، اُس کے اِن چشم

کشا کارناموں اور اس کی اسلامی تعلیمات سے بالکلیہ اغماض کرتے ہوئے اسے 'استخواں کی کمزوری' کا احساس دلایا جائے، لینت عظام کا طعنہ دیا جائے۔ یہ برگزیدگی کے نام پر کھلی استخواں فروشی ہے، بلکہ یہ نہ صرف اسلام کی بنیادی تعلیمات، اسلام کے آفاقی نظریات اور اسلامی روح کے منافی ہے بلکہ العیاذ باللہ قرآنی آیات کی علی الاعلان تحریف معنوی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم تقویٰ کو ہی معیار عزّ و شرف قرار دیں اور قرآنی تعلیمات پر حرف بہ حرف عمل کریں، آمین۔

یہ اُس دور کا المیہ تھا کہ 'برگزیدہ بندوں' کی ایک جماعت نے شبلی میں روحانیت کی کمی کا شکوہ کیا، مجھے حیرت ہے کہ شبلی کی تحریروں سے بے حد متاثر اور آبروئے سلف مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی اس باب میں شکوہ سنج نظر آتے ہیں اور اپنی خودنوشت سوانح حیات 'کاروان زندگی' کے ایک ذیلی عنوان 'دار العلوم کی فضا اور اپنے بانی اور معماروں سے ناآشنائی' میں لکھتے ہیں:

"یہاں کوئی دینی اور دعوتی فضا موجود نہ تھی اور ہم میں سے جو لوگ دینی ذوق رکھتے تھے، ان میں بھی طلبہ میں دینی و اصلاحی جذبہ پیدا کرنے کی قوت نہ تھی"۔ (کاروانِ زندگی، بحوالہ شبلی، مکاتیبِ شبلی اور ندوۃ العلما، ص ۱۷)

"— ساری فضا پر علمی و ادبی، تقریری و تحریری ذوق سایہ فگن تھا، دار العلوم کے ماحول میں سب سے بڑی مثالی (آئیڈیل) شخصیت، جو قابل اقتدا و تقلید سمجھی جاتی تھی اور جو طلبا کا منتہائے پرواز تخیل تھا، وہ مولانا شبلی کی ذات تھی۔ انہیں کو دار العلوم کا اصل بانی اور معمار سمجھا جاتا تھا"۔ (کاروانِ زندگی، بحوالہ شبلی، مکاتیبِ شبلی اور ندوۃ العلما، ص ۱۸-۱۷)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مزید لکھتے ہیں:

" —— ہر ذہین طالب علم (مولانا شبلی کی تقلید میں) مصنف، مورخ، ادیب و ناقد بننے کا خواب دیکھتا تھا اور قدیم اداروں، نصاب و نظام اور باہر کی شخصیتوں سے یا تو بے خبر تھا یا ان کے بارے میں کسی قدر حقارت آمیز خیالات رکھتا تھا۔ بھائی صاحب (ڈاکٹر سید عبد العلی حسینی) بھی اس صورت حال سے بہت دلگیر تھے اور دینی و روحانی شخصیتوں اور علمائے ربانی سے طلبہ کا ربط قائم کرنا چاہتے تھے۔ مگر سالہا سال کے اثر کو، جس کی جڑیں بڑی گہری تھیں، چند سال میں مٹایا نہیں جاسکتا تھا، نہ اس وقت تک کوئی ایسی دینی دعوت و تحریک سامنے آئی تھی، جو یہاں کے نوجوانوں کو مانوس و متاثر کرسکتی اور جس سے ربط و تعلق کا مشورہ دیا جاسکتا"۔ (کاروانِ زندگی، بحوالہ شبلی، مکاتیبِ شبلی اور ندوۃ العلما، ص ۱۸)

مولانا سید محمد الحسنیؒ کو بھی شبلیؒ کی شخصیت میں بہت سی ناپسندیدہ غیر مرئی چیزیں اور غیر اسلامی عوامل نظر آئے ہیں۔ وہ 'سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری' میں لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی کی ذہنی و فکری نشو و نما اور ارتقاء میں علی گڑھ کا خاصا حصّہ ہے۔ وہ آرنلڈ کے شاگرد تھے، سرسید کے خیالات و افکار سے باوجود اختلاف کے متاثر تھے۔ علماء و مشائخ سے ان کو وہ تعلق نہیں تھا جو مولانا محمد علی کو تھا اور باوجود اس کے کہ وہ علی گڑھ کے مفید و مضر رجحانات کی پوری طرح تمیز رکھتے تھے، بہرحال بشریت سے خالی نہ تھے۔ اس متلاطم سمندر میں رہ کر تر دامن نہ ہونا اور اس ایک طرفہ ماحول میں قلب اور عقل کے حدود و امتیازات کو ملحوظ رکھنا اور روحانی خلا کا احساس ان کے لیے قدرتی طور پر دشوار تھا، جس منزل پر وہ اپنی آخری عمر میں پہنچے تھے اور جس نے ان کو 'سیرتِ رسول' کی طرف متوجہ کیا تھا، وہ منزل اُس وقت اُن سے بہت دور تھی"۔

(سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری، ص ۲۸۹-۲۷۸، بحوالہ شبلی، مکاتیبِ شبلی اور ندوۃ العلما، ص ۱۹)

اِس تحریر کے بین السطور پر غور فرمایئے اور شبلی کی علمی شخصیت کی توقیت کے لیے جو میزان مقرر کیا گیا ہے اس کے ایک پلڑے میں چپکائے ہوئے غیر مرئی روحانی مقناطیس کو محسوس کیجیے، اور

بہت سی اوّلیات، جو شبلیؒ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی تھیں، ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے محولہ بالا اقتباسات پر غور کیجیے! آپ پر سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ تاریخ نویسی میں اگر تاریخ نگاری کا انداز اختیار کیا جائے، یا ایک خاص ذہن اور مزاج کو سامنے رکھ کر تاریخ لکھی جائے تو اس میں جانب داری لازمی طور پر در آتی ہے اور معروضیت کی بجائے ادعائیت کے عناصر جگہ پا جاتے ہیں۔ ایسے میں تاریخ نگار کی اوّلین کوشش، بلکہ مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ واقعاتِ عالم اسی کی عینک سے دیکھا جائے۔ اسی لیے تو مولانا سید محمد الحسنیؒ کو شبلیؒ میں آرنلڈ کی شاگردی تو نظر آئی لیکن کسی عالمِ دین کا نام ذہن میں نہیں اُبھرا، جس کے سامنے شبلیؒ باادب بیٹھے ہوں۔ علمِ دین کی طلب میں شبلیؒ کہاں کہاں گئے؟ اس کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ علی گڑھ کے داخلی ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے شبلیؒ نے طلباء میں سیرتِ رسول ﷺ کے بیان کا جو سلسلۃ الذہب شروع کیا، اس پر بھی تاریخ نگار نظر نہیں پڑی، سچ ہے کہ منتخب مطالعہ کے کمالات اس طرح کی تحریروں میں خوب جلوہ نما ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایک بشر میں بشریت تلاش کرنے کی بجائے ملکوتی صفات کیوں ڈھونڈی جا رہی ہیں؟۔ اپنے قول ''روحانی خلا کا احساس اُن کے لیے قدرتی طور دشوار تھا'' کے بین السطور مولانا سید محمد الحسنیؒ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ اور ''سیرتِ رسول'' لکھے جانے کو آخری عمر کی اصلاح سے جوڑ کر کون سی کہانی سنانا چاہتے ہیں؟ مولانا سید محمد الحسنیؒ خوب جانتے ہیں کہ شبلی کا آخری علمی کام ''سیرت النبی'' ہے، لیکن اس کو ''سیرتِ رسول'' کا نیا نام دے کر شعوری یا غیر شعوری طور سے مستقبل بعید کے لیے ایک نیا اُلجھاؤ، ایک نئی بحث کی بنیاد ڈال رہے ہیں؟ سیرت النبی ﷺ پر کام، اُن کی زندگی کا سب سے بڑا منصوبہ تھا، جو سالہا سال کے غور و فکر کے بعد مرتب ہوا تھا، وہ اپنے رفقاء کو بھی اسلامی شخصیات پر لکھنے کے لیے مہمیز کیا کرتے تھے، جس کی مثالیں ان کے خطوط میں جا بجا ملتی ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ شبلی پر ہر بزرگ اور کو چک کمان تانے کھڑا ہے، لیکن اُن کے مثل کوئی علمی کام پیش کرنے کی نظیر کی تلاش میں عاجز اور بے بس نظر آتا ہے۔ شبلی کے علمی آثار میں جو جامعیت ہے اور ان کے استشہاد میں جو توانائی ہے، اس کی نظیر اس دورِ ترقی میں بھی کم ہی ملتی ہے۔ آپ 'المرتضیٰ' اور 'الفاروق' کو امعانِ نظر اے پڑھ جائیے، پھر چشم تصور سے آج سے سو سال پہلے کے عہد کو دیکھیے اور شبلی کے علمی آثار میں اُن کے حوالوں اور لوازموں کی فراہمی کے طور طریقوں اور اُس دور کی صعوبتوں پر غور کیجیے اور پھر آج کے گلوبل دور کا اس سے موازنہ کیجیے۔ اِس گلوبلائیزیشن نے ساری دنیا کو گویا کفِ دست پر رکھ دیا ہے اور اُن قدیم مصادر کا ایک بڑا حصہ آج ایک جنبش انگشت پر آپ کی نظروں کے سامنے آ جاتا ہے، جن کے لیے شبلی اور شبلی صفت لوگ دور دراز علاقوں اور ملکوں کی خاک چھانتے پھرے تھے۔

شبلی کے بارے میں مولانا سید محمد الحسنیؒ کی اِس تحریر نے بہتوں کو رنجور کیا ہے، اس حوالہ سے ڈاکٹر عمیر منظر ماہنامہ معارف، جولائی ۱۹۶۵ء میں شائع مولانا مجیب اللہ ندوی کی ایک تحریر نقل کرتے ہیں:

''جہاں مولانا محمد علی اور علامہ شبلی کی طبیعتوں کا موازنہ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں ان کے خاندانی اثرات کا ذکر کر کے ان کی سیمابیت اور انتہا پسندی کا جو بھیانک نقشہ پیش کیا گیا اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے، وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ شائستگیٔ قلم کے بھی منافی ہے''۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۶۵ء، ص ۴۷، بحوالہ شبلی، مکاتیب شبلی اور ندوۃ العلماء، ص ۲۰۔۱۹)

ڈاکٹر عمیر منظر نے مولانا مجیب اللہ ندویؒ کے حوالہ سے عہد رسالت کی ایک مثال بھی دی ہے اور اس تناظر میں جواب چاہا ہے، لیکن میرا قلم اس عبارت کو نقل کرنے کی ہمت بھی نہیں جٹا پا رہا ہے، لیکن مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے حرف حرف سچ لکھا ہے۔

ہم نے تو اپنے بڑوں سے یہی سنا ہے کہ کوئی نو مسلم جب دائرۂ اسلام میں آجاتا ہے تو اس پر رحمتوں کی بارش ہوتی ہے اور اس کے پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور وہ ایک نوزائیدہ کی طرح معصوم ہوجاتا ہے، لیکن شبلی میں روحانیت کی کمی کا شکوہ کرنے والے، اُن کے دادا کے قبول کے باوصف اُن میں خاندانی اثرات کا الزام دھر رہے ہیں اور ان کو نومسلم کی اولاد قرار دے کر ان کی شخصیت میں روحانیت کی کمی کی منصوبہ بند طور پر تشہیر کررہے ہیں۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کا تصورِ روحانیت کہاں سے تغذیہ پارہا ہے؟ ان کے فلسفۂ روحانیت کی تائید وتوثیق کہاں سے اور کن حوالوں سے ہورہی ہے؟ یہ سب کچھ خود اللہ کے یہ برگزیدہ بندے ہی جانیں، لیکن ہم علی رؤس الاشہاد کہہ رہے کہ یہ روحانیت کا اسلامی تصور نہیں ہے، بلکہ یہ ایک آب زدہ، کرم خوردہ اور بیمار تصور ہے۔ ہم اپنے اِس اظہار میں بے حد متشدد ہیں، کیوں کہ غیر اسلامی تصورِ روحانیت کو قرآن اور حدیث کی صریح ہدایات کے علی الرغم اہمیت دینا اور دوسروں کے ایمان وایقان کو اس پر تولنا میرے نزدیک بڑا گناہ ہے، ایک ایسا بڑا گناہ، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی نافرمانی اور اس کے بندے کی حق تلفی اور بیزاری پر منتج ہے۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو اس دلدل سے بہت جلد نکالے۔

آثارِ شبلی اور متعلقاتِ شبلی کے غیر جانب دارانہ مطالعہ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ شبلی کو علی گڑھ اور مدرسۃ العلوم میں بھی نظر انداز کیا گیا تھا اور لکھنؤ اور ندوۃ العلماء میں بھی اُن سے بے اعتنائی روا رکھی گئی تھی۔ اس کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں، جن میں سے بیشتر اسلام کی آفاقی فکر کے مغایر ہیں اور کچھ کو اسلامی فکر کا لباس حریر پہنا کر پیش کرنے کی سعی بھی ہوئی ہے اور آج بھی ہورہی ہے۔

بہرحال ڈاکٹر عمیر منظر کی اِس کتاب میں شامل مکاتیبِ شبلی کے تناظر میں جو اہم اور بنیادی عناوین بہت واضح ہوکر اور کسی واسطے کے بغیر سامنے آئے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ شبلی اور ندوۃ العلماء کے لیے زمین کا حصول
۲۔ شبلی اور تعمیرِ ندوہ کے لیے رقوم کی فراہمی کی تدابیر
۳۔ شبلی اور ندوہ کے مالی استحکام اور انتظام وانصرام کی کوششیں
۴۔ شبلی اور نصابِ تعلیم کی اصلاح وتجدید
۵۔ شبلی اور ماہنامہ الندوہ
۶۔ شبلی اور ان کے مصاحبین ندوہ
۷۔ شبلی میں روحانیت کی تلاش اور اس کا میعار ومیزان
۸۔ مکاتیبِ شبلی کی روشنی میں شبلی اور مصاحبینِ ندوہ کی تحلیلِ نفسی ——— وغیرہ وغیرہ

متذکرہ بالا مباحث میں شبلی کی دانشوری اور آبلہ پائی کی حکایتیں بھی ملیں گی اور ان کے کردار اور کردار سازی بھی، شبلی کو دار العلوم ندوۃ العلما کے منظر اور پس منظر سے ہٹانے کی سعیِ بے جا بھی ملے گی اور اس کے تحت الشعور کا شعور بالنقص بھی۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سب چیزوں کا جائزہ مکاتیبِ شبلی کے تناظر میں لیا جائے اور اگر بالفرض ان مکاتیب کے محتویات اور اس کے مشتملات کی صداقت پر کسی کو شبہ ہو تو پھر ان کے معاصر برگزیدہ بندوں کے مکتوبات دریافت کیے جائیں، کہ ندوۃ العلما اور الندوہ کی تشکیل وتعمیر سے شبلی کی بے دخلی صرف اسی طور ممکن ہے۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اب 'تاریخ دار العلوم ندوۃ العلماء' کے تجزیاتی مطالعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اب سب کچھ علی راس الشہود متعین ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر عمیر منظر کی اس کتاب میں شامل شبلی کے خطوط بڑے چشم کشا ہیں، جو شبلی شناسی کا ایک نیا نقطۂ نظر متعین کرتے ہیں۔ ہم مکاتیبِ شبلی کو اس زاویۂ نگاہ سے مرتب کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف کے بے حد ممنون ہیں۔

شبلی اور حالی

علامہ محمد اقبال

مسلم سے ایک روز یہ اقبالؔ نے کہا
دیوانِ جزو وکل میں ہے تیرا جود فرد

تیرے سرودِ رفتہ کے نغمے علومِ نو
تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد

پتھر ہے اس کے واسطے موجِ نسیم بھی
نازک بہت ہے آئینۂ آبروے مرد

مردانِ کار ڈھونڈ کے اسبابِ حادثات
کرتے ہیں چارۂ ستمِ چراغِ لاجورد

پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ راز دار
کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد

مسلم مرے کلام سے بے تاب ہوگیا
غماز ہوگئی غمِ پنہاں کی آہِ سرد

کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیتِ خزاں
اوراق ہوگئے شجرِ زندگی کے زرد

خاموش ہوگئے چمنستان کے راز دار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالیؔ بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد

"اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں
بلبلِ چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد؟"

شیخ محمد اکرام رقم طراز ہیں:

"مولانا شبلی بہ حیثیت مجموعی، وہ شاید سرسید کے بعد سب سے آگے آجاتے، آخر حالی اور آزاد، محسن اور وقار الملک کتنے آسمانوں کے تارے تھے؟ ایک یا دو تین کے۔ ان میں شبلی کی بوقلمونی کہاں سے آئے گی؟ جو رندوں میں رند تھے، زہاد میں زاہد، نثاروں میں نثار، شعرا میں شاعر، معلموں میں معلم، مورخوں میں مورخ، سیاست دانوں میں سیاسی، اردو میں عشقیہ خطوط کے بانی، تعلیم میں نئی روش کے آموزگار، علمی تصنیف وتالیف کے میدان میں ہماری زبان کے سب سے بانکے شہسوار!

قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا کیا وہ ایک معجزہ سے کم ہے۔" (بحوالہ موج کوثر، ص: ۲۳۳)

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"انھوں نے ہمارے ادب میں علم کی گہرائی اور علم و ادب میں تازگی و شگفتگی پیدا کی، وہ بڑے ستھرے اور دلکش ذوق کے مالک تھے۔۔۔ افسوس ہے کہ ان کے جانشینوں نے ان کی علمیت پر نظر رکھی۔ ان کے ذہن کی لچک اور شعریت پر توجہ نہ کی۔۔۔ شبلی نہ ہوتے تو محمد علی اور اقبال کہاں ہوتے۔۔۔"

(تنقیدی اشارے، ص: ۲۱۹)

مولانا شبلی کی حیات کے اہم پہلو

نام : مولانا شبلی نعمانی

تخلص : تسنیم، کشاف، وصاف، شبلی، نعمانی

والد کا نام : شیخ حبیب اللہ

جائے پیدائش: موضع بندول ضلع اعظم گڑھ یوپی، ۴/ جون، ۱۸۵۷ء

تعلیم : جیراج پور، اعظم گڑھ، جون پور، غازی پور، رام پور، دیوبند، لاہور، سہارن پور۔

اساتذہ : حکیم عبداللہ جیراج پوری، مولوی شکر اللہ صاحب، مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری، مولوی فیض اللہ صاحب، استاذ مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی، مولانا ارشاد حسین صاحب، مولانا فیض الحسن صاحب، محدث احمد علی سہارن پوری۔

ملازمتیں : اعظم گڑھ اور بستی میں وکالت، قائم مقام نقل نویس، قرق امین، علی گڑھ میں عربی پروفیسر، حیدرآباد میں سر رشتہ علوم وفنون کی نظامت، لکھنو میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی معتمدی۔

تصانیف : مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، المامون، سیرت النعمان، سفرنامہ مصر و روم، کلیات شبلی فارسی، رسائل شبلی، الفاروق، الغزالی، علم الکلام، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، الکلام، سوانح مولانا کے روم، موازنہ انیس و دبیر، شعرالعجم پانچ جلدیں، سیرۃ النبی، مکاتیب شبلی، کلیات شبلی اردو۔

رسالے ومضامین: ظل الغمام فی مسئلہ القراۃ خلف الامام، اسکات المعتدی علی انصاف المقتدی، الندوہ میں، مذہبی مضامین (۱۸)، ادبی مضامین (۹)، تعلیمی مضامین (۱۱)، تنقیدی مضامین (۱۷)، تاریخی مضامین (۱۷)، سیاسی مضامین۔

اسفار : سہارن پور، دیوبند، رام پور، لاہور، نینی تال، حیدرآباد، بھوپال، کشمیر، ڈھاکہ، مظفر پور، کلکتہ، دہلی، علی گڑھ، سفر حج، روم و شام، مصر، قسطنطیہ ترکی، بیروت، بیت المقدس۔

انعامات : تمغہ مجیدی، شمس العلماء کا خطاب، نظام کا عطائے وظیفہ، انجمن ترقی اردو ہند کی سکریٹری، پنجاب یونیورسٹی نے دو ہزار روپیہ کا انعام دیا۔

بیماریاں : معدہ کی مختلف شکایتیں مثلاً قبض تبخیر پیچش، اسہال، بواسیر، پاؤں کا حادثہ، بخار۔

مرض الموت: اسہال خونی، دائمی۔

انتقال : صبح ساڑھے پانچ بجے بروز چہارشنبہ ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء، مطابق ۲۸/ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ۔

مدفن : شبلی منزل اعظم گڑھ۔

سیاسی نظریہ : کانگریسی

عقد اول: مجیدن بی

عقد ثانی: نامعلوم

دولڑکے: حامد نعمانی، شیخ محمد

چارلڑکیاں: فاطمہ، رابعہ اور دولڑکیوں کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

تین بھائی: مسٹر مہدی حسن، مولوی شیخ محمد اسحٰق، مولوی جنید نعمانی۔

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی۔نئی دہلی

نذرِ شبلی

دیارِ شرق کی ہیں آبرو شبلی نعمانی
جہانِ علم ودانش میں نہیں ان کا کوئی ثانی
وہ شبلی جن کی عظمت کے نشاں ہیں ہر طرف ظاہر
سبھی ہیں قدرداں ان کے وہ ہندی ہوں کہ ایرانی
رہے وہ عمر بھر کوشاں فلاحِ ملک وملت میں
مثالی شبلی منز کے لیے ہے ان کی قربانی
نہ ہوں مرہونِ منت کیوں نہ ان کے اہل اعظم گڑھ
ہیں شبلی نیشنل کالج کے وہ اس شہر میں بانی
نمایاں شخصیت تھی ان کی سرسید کے رفقا میں
ہے جن کی آج یہ کالج یہاں میراثِ روحانی
چراغ علم ودانش ہے انہیں کے فیض سے روشن
نمایاں سارے ہندستان میں ہے جس کی تابانی
ادب تحقیق نقدِ شعر اور سیرت نگاری میں
نہیں ہے آج ہندوپاک میں ان کا کوئی ثانی
ہے حامل عالمی شہرت کی ان کی سیرت نبوی
ہے نقد شعر میں شعر العجم اک نقشِ لافانی
جہاں جیسی ضرورت تھی وہاں وہ طرز اپنائی
مقالوں سے عیاں ہے جوہرِ حسنِ زباں دانی
شعور آگہی ظاہر ہے المامون سے ان کا
ہے الفاروق میں جوشِ عقیدت کی فراوانی
نہیں ہے ان کو قدرت صرف اردو شعر گوئی پر
ہے ان کی فارسی غزلوں میں فکروفن کی جولانی
ہے ان کا صدق دل سے قدرداں احمد علی برقی
اسے جو کچھ ہے حاصل ہے انہیں کا فیضِ روحانی